اینگلس

یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم

ABID YAZDANI

دنیا کے مزدورو، ایک ہو!

فریڈرک اینگلس

یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم

دارالاشاعت ترقی

ماسکو

[illegible]
3 [illegible] روڈ اسلامیہ

فہرست

صفحہ

۱۸۹۲ء کے انگریزی ایڈیشن کے لئے
مخصوص مقدمہ ۵

یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم

۱ ۳۹

۲ ۵۷

۳ ۶۸

تشریحی نوٹ ۹۹

ناموں کا اشاریہ ۱۱۳

۱۸۹۲ء کے انگریزی ایڈیشن کے لئے مخصوص مقدمہ

یہ چھوٹی سی کتاب (۱) دراصل ایک بڑی کتاب کا حصہ ہے۔ ۱۸۷۵ء کے لگ‌بھگ ڈاکٹر ڈیورنگ نے، جو برلن یونیورسٹی کا لکچرر ہے، اچانک خاصے زورشور کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ وہ سوشلزم کا پیرو ہو گیا ہے اور اس نے جرمن پبلک کو نہ صرف ایک تفصیلی سوشلسٹ نظریہ دیا بلکہ سماج کی تنظیم نو کے لئے ایک عملی منصوبہ بھی پیش کیا۔ قدرتی طور پر اس کی اپنے پیش رووں سے ٹکر ہو گئی۔ اور اس نے سب سے بڑھ کر مارکس کو اپنے تمام تر غیض و غضب کا شکار بنا کر ان کی عزت افزائی کی۔

یہ واقعہ ٹھیک اس وقت پیش آیا جب جرمنی میں سوشلسٹ پارٹی کے دو حصے — آئزی‌ناخ والے اور لاسال والے (۲) — متحد ہوئے ہی تھے اور اس طرح نہ صرف پارٹی کی طاقت میں بے اندازہ اضافہ ہوا تھا، بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ اس میں اپنی تمام تر طاقت کو مشترک دشمن کے خلاف استعمال کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوئی تھی۔ جرمنی میں سوشلسٹ پارٹی بہت تیزی سے ایک ذی اثر جماعت بن رہی تھی لیکن اس کو ایک طاقت بنانے کے لئے اولین شرط یہ تھی کہ اس نئے حاصل کئے ہوئے اتحاد پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اور ڈاکٹر ڈیورنگ نے کھلم کھلا اپنے چاروں طرف ایک گٹ بنانا شروع کیا جو مستقبل کی ایک علیحدہ پارٹی کا مرکزی نقطہ بن سکے۔ لہذا ہمارے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن یہ چیلنج منظور کر لیں اور میدان کارزار میں اتر پڑیں۔

لیکن یہ سارا معاملہ بہت زیادہ مشکل نہ سہی، پھر بھی طول طویل اور پیچیدہ تو ضرور تھا۔ جیسا کہ سبھی جانتے ھیں ھم جرمن لوگ ایک نہایت ھی وزنی Gründlichkeit کے مالک ھیں، اسے چاھے گمبھیر گہرائی کہئے یا گہری گمبھیرتا سمجھئے۔ جب کبھی ھم میں سے کوئی شخص اپنے خیال میں کوئی نیا نظریہ پیش کرتا ھے تو پہلے وہ اسے ایک تفصیلی اور ھمہ گیر نظام کی شکل ضرور دیتا ھے۔ وہ یہ ضرور ثابت کرتا ھے کہ منطق کے اولین اصول اور کائنات کے بنیادی قوانین دونوں چیزیں ازل سے محض اسی مقصد کی خاطر موجود تھیں کہ آخرکار اس سب سے بہتر اور نئے دریافت‌شدہ نظرئے کی سمت لےجائیں۔ اور اس لحاظ سے ڈاکٹر ڈیورنگ قومی معیار پر بالکل پورا اترا۔ ایک مکمل ”نظام فلسفہ“ — ذھنی، اخلاقی، فطری اور تاریخی، ایک مکمل ”سیاسی معاشیات اور سوشلزم کا نظام“، اور اس کے علاوہ ”سیاسی معاشیات کی تنقیدی تاریخ“ — یہ بڑے سائز کی تین موٹی موٹی جلدیں ھیں، خارجی اور اندرونی دونوں لحاظ سے وزنی اور دلائل کے لامتناھی سلسلے پر مشتمل، جو عام طور پر تمام پہلے فلسفیوں اور ماھرین‌معاشیات کےخلاف اور خصوصاً مارکس کے خلاف جمع کئے گئے ھیں — یعنی دراصل مکمل طور پر ”سائنس میں انقلاب“ لانے کی کوشش — یہ تھیں وہ چیزیں جن سے مجھے عہدہ برآ ھونا تھا۔ مجھے تصور زمان ومکان سے لے کر دو دھاتی اصول (Bimetallism) (۳) تک، مادے اور حرکت کی ابدیت سے لے کر اخلاقی تصورات کی فانی فطرت تک، ڈارون کے فطری انتخاب سے لے کر مستقبل کے سماج میں نوجوانوں کی تعلیم تک، ھر ممکن موضوع پر بحث کرنی تھی۔ بہرحال میرے مدمقابل کی باقاعدہ اور منظم ھمہ گیری نے مجھے اس کا موقع دیا کہ میں اس کےخلاف ان تمام مختلف موضوعات پر اپنے اور مارکس کے نقطۂنظر کی پہلے سے زیادہ مربوط طریقے سے مزید تشکیل و تکمیل کروں۔ اور یہی وہ سب سے بڑا اور اھم سبب تھا جس کی بنا پر مجھے یہ کام اپنے ذمے لینے پر آمادہ ھونا پڑا، حالانکہ اور لحاظ سے یہ ایک ناپسندیدہ کام تھا۔

میرا جواب سب سے پہلے تو سوشلسٹ پارٹی کے سب سے بڑے آرگن ، لائپزگ شہر کے ”فوروارٹس،، (۴) میں کئی سلسلہ‌وار مضامین کی شکل میں شائع ہوا اور بعد میں کتابی شکل میں «Herrn Eugen Dührings Umwälzung der Wissenschaft» (”مسٹر ڈیورنگ کا سائنس میں انقلاب،،) کے نام سے۔ اور اسی کا دوسرا ایڈیشن زورخ میں ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔

اپنے دوست پول لافارگ کے کہنے سے ، جواب فرانسیسی ایوان نمائندگان میں لیل کے نمائندے ہیں ، میں نے اس کتاب کے تین ابواب کتابچے کی شکل میں ترتیب دئے اور اس کتابچے کا ترجمہ کر کے انہوں نے اسے ۱۸۸۰ء میں «Socialisme utopique et socialisme scientifique» (یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم) کے عنوان سے شائع کیا۔ اس فرانسیسی ٹکسٹ سے ایک پولستانی اور ایک هسپانوی ایڈیشن تیار کیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں همارے جرمن دوستوں نے اس کتابچے کو اس کی اصلی زبان میں شائع کیا۔ اس کے بعد سے جرمن اصل کے مطابق اطالوی ، روسی ، ڈینش ، ولندیزی اور رومانیائی ترجمے بھی چھپ چکے هیں ، اور اب یه چھوٹی سی کتاب ، اس موجوده انگریزی ایڈیشن سمیت ، دس زبانوں میں پڑھی جا رهی هے۔ جهاں تک مجھے علم هے اور کوئی سوشلسٹ تصنیف یهاں تک که همارے ۱۸۴۸ء میں لکھے هوئے ”کمیونسٹ مینی‌فیسٹو،، یا مارکس کی کتاب ”سرمایه،، کا بھی اتنی متعدد بار ترجمه نهیں هوا هے۔ جرمنی میں اس کے چار ایڈیشن چھپ چکے هیں جو کل ملا کر بیس هزار نسخوں پر مشتمل هیں۔

اس کا ضمیمه ”مارک،، (۵) اس غرض سے لکھا گیا تھا که جرمن سوشلسٹ پارٹی کی صفوں میں ، جرمنی میں زمین کی ملکیت کے ارتقا کی تاریخ کے متعلق ابتدائی معلومات پھیلائی جا سکیں۔ یه کام اس وقت اور بھی زیاده ضروری معلوم هوتا تھا جبکه اس پارٹی نے شهر کے محنت کشوں کو اپنے اندر جذب کرنے کا کام تقریباً ختم کر لیا تھا اور جبکه اسے کھیت مزدوروں اور کسانوں کی ذمه‌داری لینی تھی۔ یه ضمیمه ترجمے کی عبارت میں شامل کر لیا گیا هے کیونکه زمین کے حق ملکیت کی ان اولین شکلوں سے ، جو جرمن قبیلوں

میں مشترک تھیں ، اور ان کے زوال کی تاریخ سے انگلستان میں تو لوگ جرمنی سے بھی کم واقف ھیں - میں نے ٹکسٹ کو اس کی اصلی شکل کے مطابق ھی رھنے دیا اور اس مفروضے کی طرف اشارہ نہیں کیا ھے جو حال ھی میں میکسم کوالیفسکی نے پیش کیا ھے ، جس کے مطابق قابل کاشت زمینیں اور چراگاھیں مارک کے اراکین میں تقسیم ہونے سے پہلے یہ صورت حال تھی کہ ایک وسیع سرقبیلی خاندانی برادری ، جس میں کئی پشتیں شامل ھوتی تھیں (جس کی مثال آج بھی جنوبی سلافی زادروگا سے ملتی ھے) ، ساجھے کے کھاتے پر ان زمینوں کی کاشت کرتی تھی ، اور بعد میں صرف اسی وقت تقسیم کا سلسلہ شروع ھوا جبکہ برادری بہت پھیل گئی اور ساجھے کے کھاتے کے انتظام کے لئے ضرورت سے زیادہ بڑی اور قابو سے باھر ھو گئی (٦) - کوالیفسکی غالباً بالکل ٹھیک کہتا ھے لیکن یہ معاملہ ابھی زیرغور (sub judice) ھے -

اس تصنیف میں جتنی نئی معاشی اصطلاحات استعمال کی گئی ھیں وہ سب مارکس کی تصنیف ''سرمایہ،، کے انگریزی ایڈیشن میں استعمال شدہ اصطلاحات کے مطابق ھیں - ھم ''جنس تبادلہ کی پیداوار،، اس معاشی دور کو کہتے ھیں جس میں اشیا محض پیدا کرنے والے کے استعمال کے لئے ھی نہیں بلکہ تبادلے کی غرض سے بھی پیدا کی جاتی تھیں — یعنی جنس تبادلہ کی حیثیت سے ، استعمالی اقدار کی حیثیت سے نہیں- یہ دور اس وقت شروع ھوتا ھے جب تبادلے کے لئے پیداوار کا آغاز ھوا تھا اور ھمارے زمانے تک قائم ھے - یہ صرف سرمایہ‌داری طریق پیداوار کے تحت ھی پوری نشو و نما پاتا ھے ، یعنی صرف انہیں حالات کے تحت جب سرمایہ‌دار — ذرائع پیداوار کا مالک — اجرت پر مزدوروں کو نوکر رکھتا ھے ، جو اپنی قوت محنت کے سوا اور تمام ذرائع پیداوار سے محروم ھوتے ھیں ، اور اپنی لاگت اور اشیائے پیداوار کی قیمت فروخت کے فرق سے جو منافع حاصل ھوتا ھے اسے اپنی جیب میں ڈالتا ھے - ھم قرون وسطی سے اب تک صنعتی پیداوار کی تاریخ کو تین دوروں میں تقسیم کرتے ھیں : (١) دستکاری ، چھوٹے چھوٹے استاد کاریگر اور چند اجرت یافتہ کاریگر اور شاگرد مل کر کام کرتے ھیں ، اس میں ھر مزدور مکمل چیز

تیار کرتا ھے۔ (۲) کارخانہداری ، جہاں کاریگروں کی بڑی تعداد جو ایک بڑے کارخانے میں جمع ھوتی ھے ، تقسیم محنت کے اصول پر مکمل شے تیار کرتی ھے ، ھر مزدور پورے کام کا صرف ایک حصہ کرتا ھے اور اس طرح تیارشدہ پیداوار باری باری سب لوگوں کے ھاتھ سے نکلنے کے بعد ھی مکمل ھوتی ھے۔ (۳) جدید صنعت ، جس میں تیارشدہ شے قوت سے چلنے والی مشینوں کے ذریعہ پیدا کی جاتی ھے اور جہاں مزدور کا کام میکانکی عامل (مشین) کے کاموں کی نگرانی اور اصلاح تک محدود ھے۔

مجھے بخوبی احساس ھے کہ اس تصنیف کے نفس مضمون پر برطانوی پبلک کے ایک خاصے بڑے حصے کو اعتراض ھوگا۔ لیکن اگر ھم یوروپی لوگ برطانوی '' سفیدپوشوں ،، کے تعصبات کی طرف ذرہ برابر دھیان بھی دیتے تو ھماری جو حالت اس وقت ھے اس سے بھی بدتر ھوتی۔ یہ کتاب اس چیز کی حمایت کرتی ھے جسے ھم '' تاریخی مادیت ،، کہتے ھیں اور لفظ '' مادیت ،، برطانوی قاریوں کی بہت بڑی اکثریت کے لئے بڑا سامعہ خراش ھے۔ فلسفۂ تشکیک (یا لاادریت) (۷) کو برداشت کیا جاسکتا ھے لیکن فلسفۂ مادیت سراسر ناقابل قبول ھے۔

لیکن اس کے باوجود سترھویں صدی سے لےکر اب تک تمام جدید فلسفۂ مادیت کا اصلی وطن انگلستان ھی رھا ھے۔

'' فلسفۂ مادیت برطانیہ عظمی کا فطری بیٹا ھے۔ برطانوی ماھر علم کلام (۸) ڈنس اسکاٹس نے سوال کیا تھا کہ ' مادے کےلئے سوچنا ممکن ھے یا نہیں ؟ ،

'' اس معجزے کو بہروئےکار لانے کےلئے اس نے خدا کو قادر مطلق مان کر اس کے سائے میں پناہ لی ، یعنی دینیات (۹) سے مادیت کا پرچار کرادیا۔ اس کے علاوہ وہ اسمیت پسند تھا۔ فلسفۂ اسمیت (۱۰) جو فلسفۂ مادیت کی سب سے پہلی شکل ھے ، زیادہتر انگریز ماھرین علم کلام کے درمیان پایا جاتا ھے۔

'' انگریزی مادیت کا حقیقی مورث اعلی بیکن ھے۔ اس کے نزدیک طبیعی فلسفہ ھی واحد سچا فلسفہ ھے اور حواس کے تجربے پر مبنی علم طبیعیات طبیعی فلسفے کا اھمترین حصہ ھے۔ وہ اکثر

انکساگورس اور اس کے homoiomeriae (۱۱) اور دیمو کریتس اور اس کے سالمات (ایٹم) کو سند کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حواس غلطی نہیں کر سکتے اور وہی تمام‌تر علم کا سرچشمہ ہیں۔ تمام سائنس کی بنیاد تجربے پر ہے اور وہ حواس کے فراہم کئے ہوئے مواد کی ایک عقلی طریقۂ تحقیق سے چھان بین کرتی ہے۔ استقرأ (جزئی مثالوں سے کل نتیجہ اخذ کرنا)، تجزیہ، موازنہ، مشاہدہ اور تجربہ اس عقلی طریقے کی خاص شکلیں ہیں۔ مادے کی بنیادی خصوصیات میں اولین اور اہم‌ترین خصوصیت حرکت ہے — حرکت صرف اپنی ریاضیاتی اور میکانکی شکل میں ہی نہیں بلکہ خاص طور پر مادے کی تحریک و تہیج کی، حیاتی ترنگ کی اور تناؤ کی شکل میں — یا یاکب بیمے کی اصطلاح میں — مادے کے کوال (qual) * کی شکل میں۔

'' اپنے پہلے خالق بیکن ہی کی شخصیت میں فلسفۂ مادیت اپنے اندر گوناگوں اور ہمہ‌پہلو ارتقا کے بیج لئے ہوئے ہے۔ ایک طرف تو مادہ محسوس، شاعرانہ کشش میں لپٹا ہوا اپنی من‌موہنی مسکراہٹوں کے ذریعے انسان کے تمام تر وجود کو اپنی طرف کھینچتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اور دوسری طرف یہ بلاغت کےساتھ تشکیل دیا ہوا نظریہ ان ناہمواریوں سے بھرپور جو دینیات سے لی گئی ہیں۔

'' اپنے مزید ارتقا کے دوران میں فلسفۂ مادیت یک‌رخا ہوجاتا ہے۔ ہوبس وہ شخص ہے جس نے بیکن کے فلسفۂ مادیت کو نظم و ترتیب

---

* کوال (qual) ایک فلسفیانہ رعایت لفظی ہے۔ '' کوال '' کے لفظی معنی ہیں کرب، یا ایک ایسا درد جو کسی نہ کسی قسم کے عمل پر ابھارتا ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ صوفی بیمے اس جرمن لفظ میں لاطینی لفظ '' کوالیتاس '' (qualitas) کے معنی کی آمیزش بھی کر دیتا ہے۔ اس کا '' کوال ''، ایک عمل پر ابھارنے والا اصول تھا جو باہر سے عائد ہونے والے درد کے برخلاف اپنے اثر میں آنے والی شے، تعلق یا شخص کے بےساختہ، فطری ارتقا سے پیدا ہوتا تھا اور پھر خود اس ارتقا کو آگے بڑھاتا تھا۔ (انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا نوٹ)

بخشی۔ حواس پر مبنی علم اب اپنی شاعرانہ شگفتگی اور دل کشی کھوبیٹھتا ہے اور ریاضی‌داں کے مجرد تجربے کے دائرے میں داخل ہوجاتا ہے۔ علم ہندسہ یا جیوسٹری کے ملکۂ علوم ہونے کا اعلان کر دیاجاتا ہے۔ مادیت مردم بیزاری اختیار کرلیتی ہے۔ اگر مادیت کو اپنی حریف، مردم‌بیزار اور بے‌رنگ و نور روحانیت سے خود اسی کے میدان میں ٹکر لے کر اس پر غالب آنا ہے، تو اس کےلئے نفس کش اور رہبانیت پسند بننا لازمی ہوجاتا ہے۔ اس طرح مادیت ایک حواسی شے کےبجائے عقلی شے بن‌جاتی ہے۔ لیکن اسی وجہ سے اس میں وہ نتائج سے بے‌نیاز استقامت اور استواری بیدا ہو جاتی ہے جو عقل کی خصوصیت ہے۔

"ہوبس، بیکن کے جانشین کی حیثیت سے اس طرح استدلال کرتا ہے: اگر تمام تر انسانی علم کا سرچشمہ حواس ہی ہیں تو ہمارے تصورات اور خیالات عالم حقیقی کی ان برچھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں، جنھیں ان کی حواسی شکلوں سے محروم کردیا گیا ہو۔ فلسفہ بس اتنا ہی کر سکتا ہے کہ ان پرچھائیوں کو نام دے دے۔ ان میں سے کئی پر ایک ہی نام کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ ناموں کے بھی نام ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم ایک طرف تو یہ کہیں کہ تمام خیالات کی بنیاد حواس کی دنیا پر ہے اور دوسری طرف یہ کہیں کہ لفظ محض لفظ ہی نہیں بلکہ کچھ اس سے بڑھ کر ہے، اور یہ بھی کہیں کہ ان وجودوں کے علاوہ جن کو ہم اپنے حواس کی مدد سے جانتے ہیں اور جو سب کے سب انفرادی وجود ہیں، کچھ ایسے وجود بھی ہیں جو انفرادی کے بجائے عمومی کردار کے حامل ہیں، تو یہ چیز ایک تضاد کی طرف اشارہ کرےگی۔ غیرجسمانی ہیولا یا مادہ— بھی اتنی ہی مہمل چیز ہے جتنی غیرجسمانی جسم۔ جسم، ہیولا، مادہ، وجود ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ خیال و فکر کو سوچنے والے مادے سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ دنیا کے اندر ہونے والی تمام تبدیلیوں کی تہ میں یہی مادہ کارفرما ہے۔ لفظ "غیرمحدود" بے معنی لفظ ہے، سوائے اس کے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ ہمارا ذہن اضافہ کرتے رہنے کے لامتناہی عمل کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چونکہ ہم صرف مادی اشیا

کاادراک اور شعور کر سکتے ہیں اس لئے ہم خدا کے وجود کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ صرف میرا اپنا وجود یقینی ہے۔ ہر انسانی جذبہ ایک میکانکی حرکت ہے جس کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہوتی ہے۔ اور جس چیز کو ہم خیر کہتے ہیں وہ دراصل تہیج یا جذبے کا مقصود ہے۔ انسان بھی انہیں قوانین کا تابع ہے جن کی تابع فطرت ہے۔ قوت اور آزادی بالکل یکساں چیزیں ہیں۔

"ہوبس نے بیکن کے فلسفے کو منظم تو کر دیا لیکن اس نے بیکن کے بنیادی اصول، یعنی تمام تر انسانی علم کی بنیاد حواس کی دنیا پر ہونے کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ یہ ثبوت لاک نے اپنے "انسانی فہم و ادراک پر ایک مضمون"، میں پیش کیا (۱۲)۔

"ہوبس نے بیکن کی مادیت کے خداپرستانہ (theistic) (۱۳) تعصبات کی دھجیاں اڑا دیں۔ کولنس، ڈوڈویل، کاورڈ، هارٹلی اور پریسٹلی نے اسی طرح ان تمام آخری دینیاتی سلاخوں کو توڑ ڈالا جو ابھی تک لاک کے فلسفۂ محسوسیت (۱۴) کو مقید کئے ہوئے تھیں۔ بہر صورت عملی مادیت پسندوں کےلئے فلسفۂ الوھیت (۱۵) (Deism) مذہب سے چھٹکارا پانے کا ایک آسان طریقہ ہے۔"*

کارل مارکس نے جدید مادیت کی برطانوی اصل اور بنیاد کے متعلق اس طرح لکھا تھا۔ اگر مارکس کی زبانی اپنے آبا و اجداد کی یہ ستائش آج انگریزوں کو پسند نہیں تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہرحال یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بیکن، ہوبس اور لاک فرانسیسی مادیت پسندوں کے اس درخشاں مکتب فکر کے مورث اعلی ہیں جس نے، ان تمام بحری اور بری جنگوں کے باوجود جن میں جرمن اور انگریز فرانسیسیوں کے مقابلے میں فتح یاب ہوئے تھے، اٹھارھویں

---

* مارکس اور اینگلس «Die Heilige Familie» فرینکفورٹ، ۱۸۴۵ء، صفحات ۲۰۴ — ۲۰۱۔

مارکس اور اینگلس کی اس کتاب کا پورا نام ہے «Die Heilige Familie oder Kritik der kritischen Kritik. Gegen Bruno Bauer und Konsorten» (مقدس خاندان یا تنقیدی تنقید کی تنقید — برونو باؤیر اور کمپنی کے خلاف۔) (ایڈیٹر)

صدی کو سب سے بڑھ کر فرانسیسی صدی بنا دیا تھا — اور یہ اس سرفرازوکامران انقلاب فرانس سے پہلے ہی ہو گیا تھا جس کے نتائج کے ، ہم باہر کے لوگ ، انگلستان اور جرمنی والے ، ابھی تک عادی ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لگ بھگ اس صدی کے وسط میں انگلستان میں بس جانےوالے ہر مہذب بدیسی کو انگلستان کے ''سفید پوش ،، متوسط طبقے کی مذہبی عصبیت اور حماقت — یا وہ چیز جسے وہ اس وقت ایسا سمجھنے پر مجبور تھا — بہت نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت ہم سب مادیت‌پسند تھے یا کم از کم بہت ترقی‌یافتہ معقولی تو تھے ہی اور ہمیں یہ چیز ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی کہ انگلستان میں تقریباً تمام تعلیم‌یافتہ لوگ ہر قسم کے ناممکن معجزات پر اعتقاد رکھیں اور صرف یہی نہیں بلکہ بک‌لینڈ اور مانٹیل جیسے ماہرین علم الارض بھی اپنے مخصوص علم کے حقائق کو اس طرح توڑیں مروڑیں کہ ان کا کتاب تخلیق * کے فرضی قصوں سے بہت زیادہ تصادم نہ ہونے پائے۔ اور دوسری طرف ایسے لوگوں کو تلاش کرنے کے لئے جو مذہبی معاملات میں خود اپنی عقلی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی ہمت رکھتے تھے ، آدمی کو غیرتعلیم‌یافتہ لوگوں کے یا ان لوگوں کے درمیان جو اس زمانے میں (the great unwashed) ''میلی کچیلی جنتا ،، کہلاتے تھے ، محنت کشوں کے اور خصوصاً اووین کے پیرو سوشلسٹوں کے درمیان جانا پڑتا تھا۔

لیکن اس کے بعد انگلستان ''تہذیب یافتہ ،، ہو گیا ہے۔ ۱۸۵۱ ء کی نمائش نے (۱۶) انگریزوں کی تنگ نظر خلوت پسندی کو پیام اجل سنا دیا۔ انگلستان رفتہ رفتہ کھانے پینے ، طرز معاشرت اور خیالات ہر چیز میں بین الاقوامی بن گیا۔ اور اس حد تک بنا کہ مجھے یہ خواہش ہونے لگی کہ کاش بعض انگریزی آداب و اطوار نے بھی یورپ میں اسی قدر کامیابی حاصل کی ہوتی جتنی بعض یورپی عادات نے یہاں کی ہے۔ بہر حال زیتون کے تیل کی ترویج اور توسیع کے

---

* کتاب تخلیق — توریت کا پہلا باب۔ (مترجم)

ساتھ ساتھ (جس سے ۱۸۵۱ ء سے پہلے محض رئیس‌زادے آشنا تھے) مذہبی معاملات میں یورپی تشکیک‌پرستی کی مہلک ترویج و توسیع بھی آئی۔ اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ فلسفۂ لاادریت اگرچہ ابھی تک کلیسائے انگلستان جتنی "خاصے کی چیز" تو نہیں سمجھا جاتا لیکن پھر بھی جہاں تک اس کے باعزت ہونے کا تعلق ہے وہ بپٹزم کی برابری تو ضرور ہی کرنے لگا ہے اور "نجات فوج" (۱۷) (Salvation Army) سے تو یقیناً اس کا سرتبہ اونچا ہو چکا ہے۔ اور میں یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان حالات کے تحت بہت سے ایسے لوگوں کو جو خلوص سے بے‌دینی کی اس ترقی پر افسوس اور اس کی مذمت کرتے ہیں یہ معلوم کرکے کچھ تسلی ہوگی کہ یہ "نت‌نئے نظرئے" اصلاً بدیسی نہیں ہیں اور نہ روزانہ استعمال کی اکثر اشیا کی طرح "جرمنی کے بنے ہوئے" ہیں، بلکہ بلاشبہ خاص الخاص قدیم انگریزی ہیں، اور یہ معلوم کرکے بھی انہیں کچھ تسلی ہوگی کہ دو سو سال پہلے ان نظریوں کے برطانوی بانی اس حد سے کہیں آگے نکل گئے تھے جہاں تک پہنچنے کی آج ان کی اولاد ہمت کر سکتی ہے۔

واقعی فلسفۂ لاادریت لنکاشائر کی ایک بلیغ اصطلاح میں "معذرت خواہ" مادیت کے سوا اور ہے کیا؟ فلسفۂ لاادریت کے پیرو کا تصورفطرت شروع سے آخر تک مادی ہے۔ پوری فطری دنیا قانون کے تابع ہے اور اس میں باہر کے کسی عمل کی دخل‌اندازی کی مطلق گنجائش نہیں۔ لیکن فلسفۂ لاادریت کا پیرو یہ اور کہتا ہے کہ ہمارے پاس جانی بوجھی کائنات کے ماورا کسی ہستیٔ اعلی کے وجود کو ثابت یا باطل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مگر یہ چیز اس زمانے کےلئے تو ٹھیک ہو سکتی تھی جب عظیم ہیئت‌داں لپلاس نے نپولین کے اس سوال کے جواب میں کہ اس کی کتاب «Mécanique céleste» * میں خالق کائنات کا کوئی ذکر کیوں نہیں ہے، فخر سے

---

* لپلاس۔ «Traité de mécanique céleste» (فلکی میکانیات یا علم سکون‌وحرکت کے متعلق ایک مقالہ) جلد ۵ — ۱۔ پیرس، ۱۸۲۵ ء — ۱۷۹۹ ء۔ (ایڈیٹر)

یہ کہہ دیا تھا : * «Je n'avais pas besoin de cette hypothése» لیکن آج ہمارے ارتقائی تصور کائنات میں کسی خالق یا فرماں روا کی قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایک ایسی ہستیٔ اعلی کا ذکر جو تمام موجود دنیا سے الگ تھلگ ہو ایک قسم کا تناقض لفظی ہے اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز مذہبی لوگوں کے جذبات کی خواہمخواہ توہین بھی ہے۔

اس کے علاوہ ہمارا تشکیک پرست یہ مانتا ہے کہ ہمارے پورے علم کی بنیاد ہمارے حواس کی دی ہوئی معلومات پر ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ ہم کیا جانیں کہ ہمارے حواس ہمارےلئے ان اشیا کی صحیح تصویریں فراہم کرتے ہیں یا نہیں جنہیں ہم ان کے توسط سے محسوس کرتے ہیں ؟ اور پھر وہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جب کبھی وہ اشیا یا ان کے خواص کے بارے میں بات کرتا ہے تو درحقیقت اس کی مراد ان اشیا اور ان کے خواص سے نہیں ہوتی کیونکہ ان کے متعلق تو وہ یقین سے کوئی بات جان ہی نہیں سکتا، بلکہ اس کا مطلب تو محض ان تاثرات سے ہوتا ہے جو ان اشیا اور ان کے خواص سے حواس پر پڑتے ہیں۔ یہ اس قسم کا طریقۂ استدلال ہے جسے محض مناظرے کی مدد سے شکست نہیں دی جا سکتی۔ لیکن عمل مناظرے سے پہلے سے موجود ہے۔ ** Im Anfang war die Tat اور انسان کے عمل نے انسان کی جدت طرازی کی ایجاد کردہ دقت کو بہت پہلے ہی حل کر لیا تھا۔ مٹھائی کی عمدگی کی دلیل اس کے کھانے میں ہے۔ جوں ہی ہم اشیا کی خاصیتوں کے مطابق، جو ہمیں ان میں محسوس ہوتی ہیں، انہیں اپنے استعمال میں لانا شروع کرتے ہیں اسی لمحے سے ہم اپنے محسوسات کی صحت یا غلطی کی حکمی اور یقینی آزمائش کرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ محسوسات غلط تھے تو ان اشیا کے مناسب استعمال کے بارے میں ہمارا اندازہ بھی یقیناً غلط ہوگا اور ہماری

---

* ”مجھے اس مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“ (ایڈیٹر)

** ابتدا میں عمل ہی تھا۔ یہ فقرہ گوئٹے کے ”فاؤسٹ“ سے لیا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

کوششیں رائگاں جائیں گی۔ لیکن اگر ہم اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں ، اگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شے اس تصور سے مطابقت رکھتی ہے جو ہمارا اس کے بارے میں ہے اور جس مقصد کے لئے ہم اسے استعمال کرنا چاہتے تھے اس کے لئے موزوں ہے تو یہ اس امر کا قطعی اور صریحی ثبوت ہے کہ اس شے کے اور اس کی خاصیتوں کے متعلق ہمارے جو محسوسات تھے وہ ابھی تک خارجی حقیقت سے ہم آہنگ ہیں۔ اور جب ہم ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں تو عموماً ہمیں اس سبب کو تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی جس نے ہمیں ناکامی کا منہ دکھایا ، ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ جن محسوسات کی بنا پر ہم نے عمل کیا تھا وہ یا تو نامکمل تھے یا سطحی ، یا پھر انہیں بعض دوسرے محسوسات کے نتیجوں کے ساتھ کسی ایسے طریقے سے ملایا گیا تھا جو ناموزوں تھا — یعنی جس چیز کو ہم ناقص استدلال کہتے ہیں۔ جب تک ہم اپنے حواس کی صحیح اور معقول تربیت اور ان کے صحیح استعمال کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اپنے عمل کو ان حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو صحیح اور مناسب طور پر حاصل اور استعمال کردہ محسوسات پر مبنی ہیں — اس وقت تک ہمارے عمل کے نتیجے سے ثابت ہوتا ہے کہ محسوس کردہ اشیا کی خارجی فطرت اور ہمارے محسوسات میں مطابقت اور ہم آہنگی ہے۔ آج تک تو کبھی ایک بار بھی ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ ہمارے سائنس کے ذریعے ثابت ہونے والے محسوسات ہمارے ذہنوں میں خارجی دنیا کے متعلق ایسے تصورات پیدا کرتے ہیں جو فطرتاً حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتے یا یہ کہ خارجی دنیا اور اس کے متعلق ہمارے محسوسات کے درمیان ایک خلقی بے آہنگی ہے۔

لیکن اس وقت نوکانٹی تشکیک پرست آتے ہیں اور کہتے ہیں : ہم کسی شے کی خصوصیات کو تو صحیح طور پر محسوس کر بھی سکتے ہیں لیکن اپنے کسی بھی حسی یا ذہنی عمل کے ذریعے ہم شۓ بالذات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ یہ ''شۓ بالذات'' ہماری حد ادراک سے باہر ہے۔ مدت ہوئی اس کا ہیگل جواب دے چکا ہے : اگر تم کسی شے کی تمام خاصیتوں کو جانتے ہو تو تم خود اس شے

کو بھی جانتے ہو - اب اس حقیقت کو سمجھنا اور باقی رہ جاتا ہے کہ شے ٔ مذکورہ کا وجود ہم سے الگ اور باہر ہے ، اور جب تمہارے حواس تمھیں یہ حقیقت بھی سمجھا دیں تو اس وقت تم شے ٔ بالذات کی آخری باقیات کا — کانٹ کے مشہور و معروف Ding an sich حقیقی وجود یا شے ٔ بالذات کا — ادراک بھی کر لیتے ہو - اس میں اتنی بات کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ کانٹ کے وقت میں فطری اشیا کے متعلق ہمارا مبلغ علم واقعی اس قدر غیرمکمل اور بکھرا ہوا تھا کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق ہمیں جو تھوڑی بہت واقفیت تھی اس کے پیچھے کانٹ ایک پراسرار ''شے ٔ بالذات ،، موجود سمجھتا تھا - لیکن ایک کے بعد ایک ان ناقابل ادراک اشیا کا ادراک کیا جا چکا ہے ، تجزیہ کیا جا چکا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سائنس کی عظیم الشان ترقی نے ان اشیا کو نئے سرے سے پیدا بھی کر دیا ہے - اور جس چیز کو ہم پیدا کر سکتے ہیں ، ظاہر ہے ، اسے ناقابل‌ادراک نہیں سمجھ سکتے - اس صدی کے نصف اول میں علم کیمیا کے لئے نامیاتی مادے اسی قسم کی پراسرار چیزیں تھیں - اب ہم نامیاتی عمل کے توسط کے بغیر ہی ان کو یکے بعد دیگرے ان کے کیمیاوی عناصر سے بنانے کا گر سیکھ رہے ہیں - جدید ماہرین علم کیمیا کا دعوی ہے کہ جب بلا استثنا کسی بھی جسم کی کیمیاوی ساخت معلوم ہو جاتی ہے تو اسے اس کے کیمیاوی عناصر سے بنایا جا سکتا ہے - ہم ابھی تک اعلیٰ‌ترین نامیاتی مادوں یعنی بیضبن‌دار (albuminous) اجسام کی کیمیاوی ساخت کے علم سے بہت دور ہیں ، لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم کبھی نہ کبھی ، خواہ صدیوں بعد ہی سہی ، یہ علم حاصل نہ کر لیں اور اس علم سے مسلح ہو کر مصنوعی بیضبن پیدا نہ کر سکیں - لیکن جب ہم اس منزل پر پہنچیں گے تو ساتھ ہی ساتھ ہم نامیاتی زندگی کی تخلیق بھی کر دیں گے کیونکہ زندگی اپنی پست‌ترین شکل سے لے کر اپنی بلندترین شکل تک بیضبن‌دار اجسام کے وجود کا نارمل طریقہ ہے -

بہر حال ہمارا تشکیک‌پرست جب رسمی طور پر اپنے لئے ان شرائط اور حدود کا تعین کر لیتا ہے تو پھر ایک پکے مادیت‌پسند

کی طرح گفتگو اور عمل کرتا ہے — اور وہ دراصل ھئی مادیت‌پسند۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جہاں تک ھمیں علم ہے مادہ اور حرکت یا قوت کی — جیسا کہ اب حرکت کو کہا جاتا ہے — نہ تو تخلیق کی جا سکتی ہے اور نہ ھی یہ دونوں چیزیں برباد کی جا سکتی ھیں۔ لیکن ساتھ ھی ھمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ چیزیں کبھی بھی تخلیق نہیں کی گئی تھیں۔ لیکن اگر آپ کسی مخصوص صورت میں اس اعتراف کو تشکیک‌پرست کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ تیزی سے آپ کو ھتھیار ڈالنے ہر مجبور کر دے گا۔ وہ in abstracto (عام طور پر) روحانیت (۱۸) کے امکان کو بھلے ھی تسلیم کرے لیکن in concreto (حقیقت میں) وہ اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاھتا۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ جہاں تک ھم جانتے ھیں اور جان سکتے ھیں کسی خالق کائنات یا فرماں روائے کائنات کا کوئی وجود نہیں ہے، جہاں تک ھم سمجھتے ھیں مادہ اور قوت نہ پیدا کئے جا سکتے ھیں، نہ معدوم کئے جا سکتے ھیں، ھمارے نزدیک ذھن قوت کی ایک شکل اور دماغ کا ایک کام ہے، ھم اتنا ھی جانتے ھیں کہ مادی دنیا پر اٹل قوانین کی حکمرانی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سو جس حد تک یہ تشکیک پرست ایک سائنٹفک آدمی ہے اور جس حد تک وہ کچھ جانتا ہے اس حد تک وہ مادیت‌پسند ہے۔ اور اپنے علم کی حدود سے باھر، ان میدانوں میں جن سے وہ قطعی واقف نہیں ہے، وہ اپنی لاعلمی کا یونانی زبان میں ترجمہ کرکے اسے لاادریت یا فلسفۂ تشکیک کے نام سے پکارتا ہے۔

بہر صورت ایک بات تو کم از کم صاف معلوم ھوتی ہے : یہ ظاھر ہے کہ اگر میں تشکیک‌پرست ھوتا تب بھی میں اس کتابچے میں پیش کئے ھوئے تصور تاریخ کو ”تاریخی لاادریت“ کا نام نہیں دے سکتا تھا۔ اگر میں ایسا کروں تو مذھبی لوگ میرا مضحکہ اڑائیں گے اور تشکیک‌پرست ناراض ھو کر مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا میں ان کا مذاق اڑانا چاھتا ھوں؟ لہذا مجھے امید ہے کہ خود برطانوی ”سفید پوشوں“ کو بھی ضرورت سے زیادہ دھکا نہیں پہنچے گا اگر میں اور بہت سی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی تاریخ کی

رفتار کے اس نظریے کو " تاریخی مادیت،، کی اصطلاح سے موسوم کروں جو تمام اھم تاریخی واقعات کے سبب اول اور عظیم قوت محرکه کو تلاش کرتا ھے سماج کے معاشی ارتقا میں ، طریق پیداوار اور طریق تبادله کے اندر ھونے والی تبدیلیوں میں ، ان تبدیلیوں کے نتیجے کے طور پر الگ الگ طبقات میں سماج کے تقسیم ھونے میں اور ان طبقات کی باھمی کشمکش میں۔

اور اگر میں یه ثابت کر دوں که تاریخی مادیت شاید خود برطانوی سفید پوشوں کے فائدے کی چیز بھی ھو سکتی ھے تو غالباً مجھے اور زیادہ آسانی سے معاف کیا جا سکتا ھے۔ میں نے اس حقیقت کا تذکرہ کیا ھے که تقریباً چالیس یا پچاس سال قبل انگلستان میں بسنے والے ھر مہذب بدیسی کو انگلستان کے سفید پوش ، متوسط طبقے کی مذھبی عصبیت اور حماقت — یا وہ چیز جسے وہ اس وقت ایسا سمجھنے پر مجبور تھا — بہت نمایاں طور پر محسوس ھوتی تھی۔ اب میں اس امر کی وضاحت کروں گا که اس زمانے کا انگریز سفیدپوش ، متوسط طبقه اتنا بیوقوف ھرگز نہیں تھا جتنا که وہ ایک ذھین بدیسی کو معلوم ھوتا تھا۔ اس کے مذھبی رجحانات کی توجیهه کی جا سکتی ھے۔

جس وقت یورپ قرون وسطی سے نکلا اس وقت شہروں کا ابھرتا ھوا متوسط طبقه اس کا انقلابی عنصر تھا۔ اس طبقے نے قرون وسطی کی جاگیرداری تنظیم کے درمیان ایک مانا ھوا مقام حاصل کر لیا تھا ، لیکن یه مقام بھی اس کی توسیع پذیر طاقت کے لئے بہت تنگ وسحدود ھو چکا تھا۔ متوسط طبقے یا بورژوا طبقے کا ارتقا اور جاگیرداری نظام کا قیام اب ایک دوسرے کے لئے قطعی بے میل اور بے آھنگ ھو چکے تھے۔ لہذا جاگیرداری نظام کا زوال ھونا ھی تھا۔

لیکن جاگیرداری نظام کا عظیم بین الاقوامی مرکز رومن کیتھولک کلیسا تھا۔ اس نے ساری اندرونی جنگوں کے باوجود جاگیرداری نظام رکھنےوالے تمام مغربی یورپ کو ایک واحد عظیم الشان سیاسی نظام میں متحد کر رکھا تھا جو یونانیوں کی فرقهبندی (۱۹) کے بھی اسی قدر خلاف تھا جتنا اسلامی ملکوں کے۔ اس کلیسا نے جاگیرداری اداروں کے ارد گرد الوھی تقدیس کا ایک ھالهٔ نور سا بنا رکھا

تھا۔ اس نے خود اپنے نظام مراتب کی تنظیم جاگیرداری نمونے پر کی تھی۔ مزیدبرآں وہ خود سب سے کہیں زیادہ طاقتور جاگیردار تھا کیونکہ وہ تمام کیتھولک دنیا کی پوری ایک تہائی زمینوں پر قابض تھا۔ اس سے پیشتر کہ ایک ایک ملک میں دنیوی نظام جاگیرداری پر کامیابی سے حملہ کیا جا سکے اس کلیسا کو جو اس کا مقدس مرکزی ادارہ تھا نیست و نابود کرنا ضروری تھا۔

علاوہ بریں متوسط طبقے کے عروج کے پہلو بہ پہلو سائنس کی شاندار حیات ثانیہ بھی تھی۔ علم ہیئت، علم سکون و حرکت (میکانیات)، علم طبیعیات (فزکس)، علم تشریح بدن (اناٹومی)، علم الاعضا (فیزیالوجی) کی ایک دفعہ پھر توسیع و تزئین ہونے لگی۔ اور بورژوا طبقے کو اپنی صنعتی پیداوار کی ترقی کے لئے ایک ایسی سائنس کی ضرورت تھی جو اشیائے فطرت کی طبعی خاصیتوں اور فطرت کی قوتوں کے طریقۂ عمل کو ٹھیک طور پر سمجھ سکے۔ اس وقت تک سائنس محض کلیسا کی ایک ناچیز لونڈی تھی اور ایمان و عقیدے کی عائد کی ہوئی حدود سے آگے جانے کی مجاز نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ دراصل سائنس کہلائی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ سائنس نے کلیسا کے خلاف بغاوت کی اور بورژوا طبقہ چونکہ سائنس کے بغیر کام نہیں چلا سکتا تھا لہذا اسے بھی اس بغاوت میں شریک ہونا پڑا۔

مندرجۂ بالا مثالوں سے گو صرف ایسے دو ہی نقطوں پر روشنی پڑتی ہے جہاں ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کی رائج الوقت مذہب سے ٹکر ہونی ناگزیر تھی، لیکن اتنی ہی بات یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ اول تو جس طبقے کو رومن کلیسا کے دعووں کے خلاف جدوجہد میں سب سے زیادہ براہ‌راست دل‌چسپی تھی وہ بورژوا طبقہ ہی تھا، اور دوسرے یہ کہ اس زمانے میں جاگیرداری کے خلاف ہر جدوجہد کے لئے مذہبی جامہ پہننا اور سب سے پہلے کلیسا کے خلاف جنگ‌آزما ہونا ضروری تھا۔ لیکن جب شہروں کے تاجر اور یونی‌ورسٹیاں نعرۂجنگ لگاتے تھے تو دیہاتی جنتا کے، کسانوں کے دلوں سے بھی اس نعرے کی پرزور گونج نکلتی تھی کیونکہ انہیں ہر جگہ اپنے تن و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے اپنے روحانی اور دنیوی جاگیردار آقاؤں کے مقابلے پر نکلنا پڑتا تھا۔

جاگیرداری کے خلاف بورژوا طبقے کی طویل جنگ تین عظیم اور فیصلہ کن مجادلوں میں اپنے عروج کو پہنچی۔

پہلا مجادلہ وہ تھا جو جرمنی میں '' پروٹسٹنٹ اصلاح دین ،، کے نام سے موسوم ہے۔ لوتھر نے کلیسا کے خلاف جو نعرۂ جنگ بلند کیا تھا اس کو دو سیاسی کردار رکھنےوالی بغاوتوں نے لبیک کہا : پہلے ۱۵۲۳ ء میں فرانز فون زی کنگین کی قیادت میں طبقۂ اشرافیہ کے نچلے حصے کی بغاوت ہوئی اور پھر ۱۵۲۵ ء میں کسانوں کی عظیم جنگ۔ دونوں ہی کو شکست ہوئی اور اس شکست کا سب سے اہم سبب اس جنگ میں سب سے زیادہ دل چسپی رکھنےوالے فریقوں ، یعنی شہری تاجروں یا بورژواؤں (burgher) کا تذبذب اور تلون تھا — اس تذبذب و تلون کے اسباب سے ہم یہاں بحث نہیں کر سکتے۔ اس لمحے سے یہ جدوجہد اپنے مقام سے گرکر مقامی شہزادوں اور مرکزی طاقت کے درمیان جنگ میں تبدیل ہو گئی اور آنےوالے دو سو برسوں کے لئے یورپ کی سیاسی اعتبار سے زندہ و باعمل قوموں کی صف سے جرمنی کا نام مٹا کر ہی ختم ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ لوتھر کی اصلاح دین نے جرمنی میں ایک نئے عقیدے کو ، ایک ایسے مذہب کو جنم دیا جو مطلق العنان شہنشاہیت کے لئے موزوں اور مناسب تھا۔ جیسے ہی شمال مشرقی جرمنی کے کسانوں نے لوتھری عقیدہ قبول کیا اسی وقت سے وہ آزاد انسانوں کے مقام سے گرکر زرعی غلام بن گئے۔

لیکن جہاں لوتھر ناکام رہا وہاں کالوین نے میدان جیت لیا۔ کالوین کا عقیدہ اس دور کے بےباک‌ترین بورژوا طبقے کے لئے بھی موزوں تھا۔ اس کا عقیدۂ قضا و قدر اس حقیقت کا ایک مذہبی اظہار تھا کہ مقابلے کی تجارتی دنیا میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار انسان کے جوش و سرگرمی یا ہوشیاری پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا دار و مدار ایسے حالات پر ہوتا ہے جو انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہیں۔ کامیابی یا ناکامی کسی فرد کی دوڑبھاگ یا ارادہ اور خواہش کے قابو میں نہیں بلکہ نامعلوم اور برتر معاشی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اور یہ چیز معاشی انقلاب کے اس دور پر اور بھی زیادہ صادق آتی تھی جب سارے پرانے تجارتی راستوں اور مرکزوں کی

جگه نئے راستوں اور مرکزوں نے لے لی تھی، جب امریکہ اور ہندستان کے دروازے دنیا کے لئے کھل گئے تھے اور جب معاشیات کا مقدس ترین رکن ایمان — سونے اور چاندی کی قدر و قیمت — بھی متزلزل ہو چلا تھا۔ کالوین کا کلیسائی نظام پوری طرح جمہوری اور ریبلکن تھا، اور جب اقلیم خداوندی جمہوری رنگ میں رنگ گئی تو پھر بھلا اس دنیا کی اقلیمیں شہنشاہوں، اسقفوں اور جاگیرداروں کی حلقہ‌بگوش کیسے رہ سکتی تھیں؟ اس وقت میں جبکہ جرمن لوتھری عقیدہ خوشی خوشی شہزادوں کا آلۂ کار بن گیا تھا، کالوینی عقیدے نے ھالینڈ میں ایک جمہوریہ کی اور انگلستان اور سب سے بڑھ کر اسکاٹ‌لینڈ میں باعمل اور سرگرم ریبلکن پارٹیوں کی بنیاد ڈالی۔

کالوینی عقیدے میں بورژوا طبقے کے دوسرے انقلاب عظیم کو اپنا بنا بنایا، تیارشدہ نظریہ مل گیا۔ یہ انقلاب عظیم انگلستان میں واقع ھوا — شہر کا متوسط طبقہ اسے برروئے کار لایا اور دیہاتی اضلاع کے زراعت‌پیشہ متوسط طبقے نے اسے پروان چڑھایا۔ یہ دلچسپ بات ھے کہ تینوں عظیم بورژوا بغاوتوں میں کسان ھی وہ فوج مہیا کرتے ھیں جسے لڑنے کا کام کرنا پڑتا ھے اور کسانوں کا طبقہ ھی وہ طبقہ ھے جسے فتح کے بعد اس فتح کے معاشی نتائج پوری طرح تباہ و برباد کر دیتے ھیں۔ کروسویل کے سو سال بعد انگلستان کا زراعت پیشہ متوسط طبقہ تقریباً غائب ھو چکا تھا۔ بہر حال اگر اسی زراعت پیشہ متوسط طبقے اور شہروں کے عامی عناصر کا دم قدم نہ ھوتا تو بورژوا طبقہ تنہا ھرگز اس معاملے کو انتہا تک نہ پہنچاتا اور کبھی بھی چارلس اول کو موت کے منہ تک نہ لے جاتا۔ بورژوا طبقے کی جو فتوحات اس وقت بالکل مکمل ھو چکی تھیں ان کو استوار کرنے کے لئے بھی اس انقلاب کو اور کافی آگے لے جانے کی ضرورت تھی، ٹھیک اسی طرح جیسے ۱۷۹۳ء میں فرانس میں اور ۱۸۴۸ء میں جرمنی میں ایسا کرنا ضروری تھا۔ دراصل ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہ چیز بورژوا سماج کے ارتقا کے قوانین میں شامل ھے۔

پھر انقلابی جوش و سرگرمی کی یہ افراط لازمی طور پر ایک ناگزیر رجعت‌پسندی کو اپنے جلو میں لائی اور پھر یہ رجعت‌پسندی بھی اس نقطۂ اعتدال سے آگے نکل گئی جہاں وہ خود کو قائم رکھ

سکتی تھی۔ چند در چند جنبشوں اور پینگوں کے بعد آخرکار نیا مرکزثقل دستیاب ہو ہی گیا، اور پھر وہ ایک نیا نقطۂ آغاز بن گیا۔ انگریزی تاریخ کے اس شاندار دور کا، جسے سفید پوش لوگ ''بغاوت عظیم،، کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور اس کے بعد کی جدوجہد کا خاتمہ ایک نسبتاً حقیر و غیراہم واقعہ پر ہوا جسے لبرل مورخوں نے ''شاندار انقلاب،، (۲۰) کا نام دے رکھا ہے۔

نیا نقطۂ آغاز ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے اور سابق جاگیردار زمیں داروں کے درمیان ایک سمجھوتہ تھا۔ آخر الذکر گو اب کی طرح اس وقت بھی طبقۂ اشرافیہ کہلاتے تھے لیکن دراصل بہت مدت سے وہ اس راستے پر پڑ چکے تھے جو ان کو ''سلطنت کے اولین بورژوا،، بننے کی طرف لے جاتا تھا — جیسا کہ ایک بہت بعد کے دور میں فرانس میں لوئی فلپ بن گیا تھا۔ انگلستان کی خوش قسمتی تھی کہ پرانے جاگیرداری نوابوں نے گلاب والی جنگوں (۲۱) کے دوران میں ایک دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ ان کے ورثا زیادہ‌تر قدیم خاندانوں کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود، سیدھے سلسلۂ نسب سے اس قدر دور جا پڑے تھے کہ اب وہ ایک بالکل ہی نیا گروہ بن گئے تھے جو عادات اور میلانات کے لحاظ سے جاگیردار سے زیادہ بورژوا تھا۔ وہ پیسے کی اہمیت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور انہوں نے فوراً ہزاروں چھوٹے کاشتکاروں کو بےدخل کرکے ان کی جگہ بھیڑوں کو زمینوں پر چھوڑ دیا اور اس طرح اپنا لگان بڑھانے لگے۔ ہنری ہشتم نے کلیسائی زمینوں کو اونے پونے بیچنے اور اڑانے کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے ہر نئے بورژوا زمیں‌داروں کی تخلیق بھی کی۔ جائدادوں کی بے شمار ضبطیاں اور ان جائدادوں کا بالکل یا کم و بیش نودولتیوں کو عطا کئے جانے کا سلسلہ پوری سترھویں صدی میں چلتا رہا، اور اس کا بھی نتیجہ یہی ہوا۔ لہذا ہنری ہفتم کے وقت ہی سے انگریز ''اشرافیہ،، صنعتی پیداوار کا توڑ کرنا تو الگ رہا اور الٹا اس سے بالواسطہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور ویسے تو ہمیشہ سے بڑے زمیں‌داروں کا ایک حصہ موجود رہا تھا جو معاشی یا سیاسی اسباب کی بنا پر، صنعتی بورژوا اور بینکر طبقے کے ممتاز افراد کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اسی لئے ۱۶۸۹ء کا سمجھوتہ

خاصی آسانی سے ہو گیا۔ ''عہدہ و زر،، کی سیاسی لوٹ بڑے زمیں‌دار خاندانوں کے لئے چھوڑ دی گئی تھی — بشرطیکہ بینکر ، صنعتی اور تجارتی متوسط طبقے کے معاشی مفادوں کا پہلے ہی خوب اچھی طرح خیال کرلیا گیا ہو۔ اور یہ معاشی مفاد اس وقت اتنے طاقتور تھے کہ قوم کی عام پالیسی انھیں کے اشاروں پر چلتی تھی۔ تفصیلات کے سلسلے میں تو کچھ لڑائی جھگڑا ہونا ممکن بھی تھا لیکن مجموعی طور پر اشرافیہ کا حکمراں گروہ اچھی طرح جانتا تھا کہ خود اس کی معاشی خوش‌حالی صنعتی اور تجارتی متوسط طبقے کی معاشی خوش‌حالی کےساتھ اٹوٹ بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔

اس وقت سے بورژوا طبقہ انگلستان کے حکمراں طبقوں کا ایک خاکسار لیکن مسلمہ جزو ترکیبی بن گیا۔ قوم کی لاتعداد محنت‌کش جنتا کو حلقہ بگوش رکھنے میں اس کا اور باقی حکمراں طبقوں کا مفاد مشترک تھا۔ خود تاجر یا کارخانہ‌دار اپنے کلارکوں اور مزدوروں اور گھریلو ملازموں کے مالک — یا جیسا کہ ابھی کچھ دن پہلے تک کہا جاتا تھا ان کے ''فطری بزرگوار،، کا مرتبہ رکھتا تھا۔ اس کا فائدہ اسی میں تھا کہ ان لوگوں سے حتی‌الامکان زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھا کام لے، اور اس مقصد کےلئے ان کو ایک مناسب اطاعت‌کیشی کی تربیت دینی ضروری تھی۔ یہ تاجر یا کارخانہ‌دار خود مذہبی تھا، اس کے مذہب نے اسے وہ پرچم عطا کیا تھا جس کے نیچے اس نے بادشاہ اور امرا پر فتح پائی۔ اور اب اسے یہ معلوم کرتے دیر نہیں لگی کہ اسی مذہب نے اسے اس بات کے سنہرے موقعے بھی عطا کئے ہیں کہ وہ فطری طور پر اپنے سے گھٹیا لوگوں کے ذہنوں پر اثرانداز ہو اور انھیں بےچون‌وچرا اپنے ان آقاؤں کے فرمان بجالانے پر مجبور کرے جنھیں مشیت الٰہی نے ان کے سروں پر متمکن کیا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ انگریزی بورژوا طبقے کو اب ''نیچ ذاتوں،، کو — قوم کے دولت پیدا کرنےوالے بےشمار عوام کو — محکوم‌ومجبور رکھنے کے کام میں حصہ لینا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے جو وسیلے استعمال کئے گئے ان میں مذہب کا بڑا ہاتھ تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس نے بورژوا طبقے کے مذہبی میلانات کو تقویت بخشنے میں مدد دی - اور وہ چیز تھی انگلستان میں مادیت کا فروغ - اس نئے نظرئے نے نہ صرف متوسط طبقے کے دین‌دارانہ جذبات کو ٹھیس پہنچائی، بلکہ اس نے تو یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ محض باذوق، تعلیم یافتہ آدمیوں اور عالموں کے لئے سوزوں فلسفہ ہے - اس کے برخلاف مذہب غیر تعلیم یافتہ عوام کے لئے ہے، جن میں بورژوا بھی شامل ہیں - ہوبس کے یہاں یہ نظریہ شہنشاہیت کے بے‌روک اختیار اور قدرت مطلق کے حامی کی حیثیت سے منظر عام پر آیا، اس نے مطلق العنان شہنشاہیت کو ہدایت کی کہ اس ہٹے کٹے مگر بدباطن لڑکے (puer robustus sed malitiosus) یعنی جنتا کو محکوم و مجبور رکھے - اسی طرح ہوبس کے جانشینوں، بولنگ‌بروک اور شافٹسبری کے یہاں بھی مادیت کی نئی الوہیت پسندانہ شکل منتخب لوگوں اور امرا تک محدود نظریہ ہی رہی جو اپنے کفر و الحاد اور اپنے بورژوا دشمن سیاسی تعلقات دونوں ہی چیزوں کے سبب متوسط طبقے کے لئے نفرت‌انگیز تھی - یہی وجہ ہے کہ جن پروٹسٹنٹ فرقوں نے اسٹوارٹ خاندان شاہی کے خلاف جنگ کا پرچم بلند کیا تھا اور لڑنے والے سپاہی فراہم کئے تھے وہی بعد میں اشرافیہ کے فلسفۂ مادیت اور عقیدۂ الوہیت کے مقابلے میں بھی ترقی‌پسند متوسط طبقے کی طاقت و قوت کا سب سے اہم حصہ فراہم کرتے رہے، اور آج بھی وہ ''عظیم لبرل پارٹی،، کی بشت‌بناہ بنے ہوئے ہیں -

اسی اثنا میں فلسفۂ مادیت انگلستان سے فرانس کی طرف منتقل ہو گیا، وہاں وہ فلسفیوں کے ایک اور مادیت پسند مکتب فکر سے، جو کارٹیزینزم (۲۲) کی ایک شاخ تھا، دوچار ہو کر اس کے ساتھ مربوط و متحد ہو گیا - شروع شروع میں فرانس میں بھی یہ نظریہ صرف خواص ہی تک محدود نظریہ رہا - لیکن جلد ہی اس کے انقلابی کردار نے اپنے آپ کو منوا لیا - فرانسیسی مادیت پسندوں نے اپنی تنقید کو مذہبی عقائد ہی تک محدود نہیں رکھا، انہوں نے اسے توسیع دے کر ہر اس سائنسی روایت یا سیاسی ادارے پر، جس سے ان کا واسطہ پڑتا تھا، چسپاں کر دیا اور اپنے نظرئے کے اس دعوے

کو ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ہر جگہ صادق آتا ہے، انھوں نے سب سے چھوٹا راستہ اختیار کیا اور بڑی بےباکی سے اپنی عظیم و ضخیم تصنیف انسائکلوپیڈیا (Encyclopédie) میں — جس کے نام پر ان کا نام انسائکلوبیڈیائی پڑ گیا ہے — اس نظرئے کا اطلاق علم کے تمام شعبوں پر کر دیا۔ اور اس طرح اپنی دو شکلوں — کھلی مادیت یا عقیدۂ الوہیت — میں سے کسی ایک نہ ایک شکل میں یہ نظریہ فرانس کے تمام تہذیب یافتہ نوجوانوں کا عقیدہ بن گیا، یہاں تک کہ جب انقلاب عظیم کے سوتے پھوٹے تو انگریز شاہ پرستوں کے تیار کئے ہوئے نظرئے نے فرانسیسی ریپبلکنوں اور دہشت پسندوں کو ایک نظریاتی پرچم دیا اور اسی نے ''حقوق انسانی کے اعلان نامے،، (۲۳) کے لئے مضمون مہیا کیا۔

عظیم انقلاب فرانس بورژوا طبقے کی تیسری بغاوت تھی، لیکن یہ وہ پہلی بغاوت تھی جس نے مذہبی جامہ پوری طرح اتار پھینکا تھا اور جو کھلم کھلا سیاسی اصول پر لڑی گئی تھی۔ اسی طرح یہ وہ پہلی بغاوت تھی جو اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ فریقین میں سے ایک یعنی اشرافیہ بالکل تباہ و برباد اور دوسرا یعنی بورژوا طبقہ مکمل طور پر فتح یاب اور کامراں نہ ہو گیا۔ انگلستان میں انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کے اداروں کے تعلق و تسلسل اور زمیں داروں اور سرمایہ‌داروں کی باہمی مفاہمت کا اظہار قانونی نظیروں کے اسی طور پر باقی رہنے اور قانون کی جاگیردارانہ شکلوں کو گویا مذہبی فریضہ سمجھ کر قائم رکھنے میں ہوا۔ فرانس میں انقلاب نے ماضی کی روایات سے مکمل طور پر ناتہ توڑ لیا، اس نے جاگیرداری نظام کی بچی کھچی باقیات کو بھی نکال پھینکا اور مدنی مجموعۂ قوانین (۲۴) (Code Civil) بنا کر پرانے رومی قانون کو جدید سرمایہ‌داری حالات کے مطابق اس قدر استادی سے ڈھالا کہ آج بھی فرانس کا یہ انقلابی مجموعۂ قوانین سارے ملکوں کے لئے — اور انگلستان بھی اس سے مستثنی نہیں ہے — قوانین ملکیت کی اصلاحات کے سلسلے میں نمونہ کا کام دیتا ہے۔ اور یہ رومی قانون وہ تھا جو اس معاشی دور سے، جسے مارکس نے جنس تبادلہ (مال) کی پیداوار کا دور کہا ہے، میل اور مطابقت رکھنے والے قانونی تعلقات کا تقریباً

کامل اظہار ہے ۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ گو انگریزی قانون ابھی تک سرمایہ‌داری سماج کے معاشی تعلقات کا اظہار اس بربری جاگیرداری زبان میں کرتا ہے جو شۓ مذکورہ سے اسی قدر مطابقت رکھتی ہے جس قدر انگریزی ہجے انگریزی تلفظ سے — ” آپ لندن لکھتے ہیں اور اسے قسطنطنیہ پڑھتے ہیں “، ایک بار ایک فرانسیسی نے کہا تھا — لیکن یہی انگریزی قانون وہ واحد قانون ہے جس نے اس قدیم جرمن شخصی آزادی کے بہترین حصے، مقامی حکومت خوداختیاری اور قانونی عدالتوں کے علاوہ اور ہر قسم کی مداخلت سے آزادی کو صدیوں سے اپنے اندر محفوظ اور زندہ رکھا اور امریکہ اور نوآبادیات کی طرف منتقل کیا ہے ۔ یورپ میں یہ آزادیاں مطلق‌العنان شہنشاہیت کے دور میں بالکل ہی کھوئی گئی تھیں اور اب تک کسی جگہ مکمل طور پر دستیاب نہیں ہوسکی ہیں ۔

ہم اب اپنے برطانوی بورژوا طبقے کی طرف لوٹتے ہیں ۔ انقلاب‌فرانس نے اسے یہ سنہرا موقع دیا کہ یورپ کی شہنشاہیتوں کی مدد سے فرانسیسی بحری تجارت کو تباہ و برباد کردے، فرانسیسی نوآبادیات پر قبضہ کرلے اور فرانس کی طرف سے بحری رقابت کے آخری دعووں کو کچل ڈالے ۔ ایک تو یہ وجہ تھی جس کی بنا پر برطانوی بورژوا طبقے نے انقلاب فرانس کی مخالفت کی — اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس انقلاب کے طریقے اس کے مزاج‌وطبیعت کےخلاف تھے — صرف انقلاب کی ” قابل نفرت “ دہشت‌پسندی ہی نہیں بلکہ بورژوا حکمرانی کو آخری حد تک لےجانے کی کوشش بھی اس کےخلاف طبیعت تھی ۔ برطانوی بورژوا اپنے طبقۂ اشرافیہ کے بغیر بھلا کیسے گذارہ کرتا — اس اشرافیہ کے بغیر جس نے اسے آداب‌واطوار سکھائے، خواہ وہ جیسے کچھ بھی ہوں، جس نے اس کےلئے فیشن ایجاد کئے، جو ملک کے اندر نظم قائم رکھنےوالی بری فوج کےلئے اور ملک سے باہر نوآبادیاتی مقبوضات اور نئی منڈیاں فتح کرنےوالی بحری فوج کےلئے افسر مہیا کرتا تھا؟ یہ ٹھیک ہے کہ بورژوا طبقے کی ایک ترقی پسند اقلیت بھی تھی، اور یہ بورژوا طبقے کا وہ حصہ تھا جس کے مفاد کا اس سمجھوتے میں اچھی طرح خیال نہیں رکھا گیا تھا ۔ اس حصے کو، جو زیادہ تر متوسط

طبقے کے کم دولت مند لوگوں پر مشتمل تھا ، انقلاب‌فرانس سے واقعی ہمدردی تھی لیکن وہ پارلیمنٹ میں بےبس تھا۔

لہذا چونکہ فلسفۂ مادیت انقلاب‌فرانس کا عقیدہ بن گیا تھا اس‌لئے خوف خدا رکھنےوالے برطانوی بورژوا نے اپنے مذہب کا دامن اور بھی مضبوطی سے پکڑلیا۔ کیا پیرس میں دہشت‌گردی (۲۰) نے ثابت نہیں کر دیا تھا کہ جنتا کی مذہبی جبلتیں ڈوب جائیں تو کیا انجام ہوتا ہے؟ جتنا زیادہ فلسفۂ مادیت فرانس سے نکل کر آس‌پاس کے ملکوں میں پھیلتا‌گیا اور دوسری اپنے سے ملتی جلتی ذہنی تحریکوں سے ، خاص طور ہر جرمنی فلسفے سے ، کسب فیض کرکے مضبوط ہوتا گیا ، اور فلسفۂ مادیت اور عام طور ہر معقول پسندی یورپ میں ہر تہذیب‌یافتہ اور باذوق آدمی کا طرۂ امتیاز بنتے گئے اسی قدر ہٹ‌دھرمی سے برطانوی متوسط طبقہ اپنے بےشمار مذہبی عقائد سے لپٹتا چلا گیا۔ یہ عقائد ایک دوسرے سے مختلف بھلے ہی ہوں لیکن وہ سب کے سب تھے نمایاں طور پر مذہبی ، عیسائی عقائد۔

فرانس میں انقلاب نے بورژوا طبقے کی سیاسی فتح کی ضمانت کی اور انگلستان میں واٹ ، آرک‌رائٹ ، کارٹ‌رائٹ اور دوسرے لوگوں نے ایک صنعتی انقلاب شروع کیا جس نے معاشی طاقت کے مرکزثقل کو بالکل ہی بدل ڈالا۔ بورژوا طبقے کی دولت زمیں‌دار اشرافیہ کی دولت سے بہت زیادہ تیزی سے بڑھنے لگی۔ خود بورژوا طبقے میں پونجی‌والے اشرافیہ اور بینکروں وغیرہ کو کارخانہ‌دار زیادہ سے زیادہ پس‌منظر میں دھکیلنے لگے۔ گو ۱۶۸۹ء کے سمجھوتے میں بتدریج اس قسم کی تبدیلیاں ہوئی تھیں جو بورژوا طبقے کے حق میں تھیں ، تاہم اس سمجھوتے کے سلسلے میں مختلف فریقوں کو جو نسبتی مقام حاصل تھا اب یہ سمجھوتہ اس سے ہم‌آہنگ نہیں رہا تھا۔ ان فریقوں کا کردار بھی بدل گیا تھا — ۱۸۳۰ء کا بورژوا طبقہ پچھلی صدی کے بورژوا طبقے سے بہت مختلف تھا۔ وہ سیاسی طاقت جو اب تک طبقۂ اشرافیہ کے پاس باقی رہ‌گئی تھی اور جسے وہ نئے صنعتی بورژوا طبقے کے دعووں کے توڑ کےلئے استعمال کرتا تھا ، نئے معاشی مفاد سے ہم‌آہنگ نہیں رہی تھی۔ اشرافیہ کے خلاف ایک نئی جدو جہد ضروری ہو گئی تھی اور اس کا انجام نئی معاشی قوت کی فتح کے علاوہ

اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اول تو ہر قسم کی مخالفت کے باوجود، ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی انقلاب کے زیراثر، قانون اصلاحات (۲۶) (Reform Act) منظور کرایا گیا۔ اس نے بورژوا طبقے کے لئے پارلیمنٹ میں ایک مضبوط اور مسلم مقام مہیا کر دیا۔ اس کے بعد "اناج کے قوانین"* کی تنسیخ ہوئی جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمیں دار اشرافیہ پر بورژوا طبقے کی، اور خاص طور پر اس کے سب سے زیادہ سرگرم و باعمل حصے، یعنی کارخانہ‌داروں کی فوقیت مسلم کر دی — یہ بورژوا طبقے کی سب سے بڑی فتح تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ آخری فتح تھی جو اس نے بلاشرکت غیرے محض اپنے مفاد کے لئے حاصل کی تھی۔ بعد میں اسے جو کچھ فتوحات حاصل ہوئیں ان سب کو اسے ایک نئی سماجی طاقت کے ساتھ بانٹنا پڑا، جو شروع میں اس کی حلیف تھی لیکن جلد ہی حریف بن گئی۔

صنعتی انقلاب نے بڑے بڑے کارخانہ‌دار سرمایہ‌داروں کے طبقے کو جنم دیا لیکن ساتھ ہی اس نے ایک اور طبقے — کارخانے میں کام کرنےوالے محنت‌کشوں کے طبقے — کو بھی جنم دیا جو تعداد میں اول‌الذکر سے کہیں زیادہ تھا۔ جس تناسب سے صنعتی انقلاب یکےبعد دیگرے صنعت کی تمام شاخوں پر چھاپہ مارتا گیا اسی تناسب سے یہ طبقہ رفتہ رفتہ تعداد اور طاقت کے اعتبار سے بڑھتا گیا۔ ۱۸۲۴ء ہی میں اس طبقے نے اپنی اس طاقت کا ثبوت دےدیا جب کہ اس نے پارلیمنٹ کو مجبور کرکے اس سے بادل ناخواستہ ان قوانین

---

* "اناج کے قوانین" — ۱۸۱۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے زمیں‌داروں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اناج کی در آمد پر بھاری محصول لگانے کے سلسلے میں جو قوانین پاس کئے ان کو "اناج کے قوانین" (Corn Laws) کہتے ہیں۔ "اناج کے قوانین" آبادی کے زیادہ مفلس حصوں کے شانوں پر ایک بھاری بوجھ تھے اور ساتھ ہی وہ صنعتی بورژوا طبقے کے لئے بھی منافع بخش نہیں تھے کیونکہ انہوں نے محنت کی قیمت بڑھا دی تھی، گھریلو منڈی کی گنجائش کو گھٹا دیا تھا اور بدیسی تجارت کی راہ میں حائل تھے۔ یہ قوانین ۱۸۴۶ء میں منسوخ کئے گئے۔ (ایڈیٹر)

کو منسوخ کروالیا جن کی رو سے مزدوروں کا سنگھٹن بنانا منع تھا (۲۷) - ریفارم ایجی‌ٹیشن کے دوران میں محنت‌کش ریفارم پارٹی کا تیز خیال (ریڈیکل) بازو تھے - ۱۸۳۲ ء کے قانون نے انھیں حق‌رائے دھندگی سے محروم کر دیا تھا، سو انھوں نے اپنی مانگوں کو حقوق نامۂ عوام (People's Charter) (۲۸) میں مرتب کیا، اور اناج کے قوانین کی مخالف عظیم بورژوا لیگ (۲۹) کے مقابلے میں اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھنےوالی پارٹی — چارٹسٹ پارٹی (۳۰) — بنائی جو جدید زمانے میں محنت‌کشوں کی پہلی جماعت تھی -

اس کے بعد فروری اور مارچ ۱۸۴۸ ء کے یورپی انقلابات آئے جن میں محنت‌کشوں نے بہت نمایاں حصہ لیا اور کم از کم پیرس میں تو انھوں نے ایسی مانگیں رکھیں جو سرمایہ‌داری سماج کے نقطۂ‌نظر سے قطعی ناقابل قبول تھیں - پھر عام رجعت‌پسندی کا دور آیا - پہلے تو ۱۰ اپریل ۱۸۴۸ ء کو چارٹسٹ لوگوں کو شکست ہوئی (۳۱)، پھر اسی سال کے ماہ جون میں پیرس کے محنت‌کشوں کی بغاوت کو کچل دیا گیا، اس کے بعد ۱۸۴۹ ء میں اٹلی، ھنگری اور جنوبی جرمنی میں بغاوتوں کی ناکامیاں واقع ہوئیں اور آخرکار ۲ دسمبر ۱۸۵۱ ء کو لوئی بوناپارٹ نے پیرس پر فتح پائی (۳۲) - کم از کم کچھ عرصے کےلئے تو مزدور طبقے کے مطالبات کا ہوا کچل ھی دیا گیا تھا — لیکن یہ چیز کس قدر مہنگی پڑی تھی! جبکہ برطانوی بورژوا پہلے ھی عوام پر مذھبیت کا رنگ چڑھائے رکھنے کی ضرورت کا قائل تھا تو ان تمام تجربوں کے بعد تو وہ اس ضرورت کو جتنی شدت سے محسوس کرتا کم تھا! اپنے یورپی ھم چشموں کے طنزواستہزا کی پروا کئے بغیر وہ مسلسل لاکھوں روپے جنتا کےدرمیان مسیحی عقیدے کی تبلیغ و اشاعت پر خرچ کرتا رھا، اور اپنے دیسی مذھبی نظام پر قناعت نہ کرکے اس نے "برادر جوناتھن" کی طرف رجوع کیا جس کا مذھب کو تجارتی حیثیت سے منظم کرنے میں کوئی ثانی نہیں تھا، برطانوی بورژوا نے امریکہ سے موڈی اور سانکی کے احیائے مذھب (Revivalism) (۳۳) کی درآمد کی اور آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے "نجات فوج" کی خطرناک مدد بھی قبول کرلی، جو ابتدائی مسیحیت کی تعلیمات کا احیا کرتی ھے، غریبوں

کو خدا کے برگزیدہ‌بندوں کی حیثیت سے مخاطب کرتی ہے ، مذہبی طریقے سے سرمایہ‌داری کےخلاف لڑتی ہے ، اور اس طرح ایک حد تک مسیحیت کے ابتدائی دور کی طبقاتی آویزش کے بعض پہلوؤں کو پروان چڑھاتی ہے ۔ اور یہ ایک روز انہیں خوشحال لوگوں کےلئے درد سر بن‌سکتی ہے جو آج اس کے واسطے بےدریغ روپیہ صرف کررہے ہیں ۔

یہ تاریخی ارتقا کا قانون معلوم ہوتا ہے کہ کسی یورپی ملک میں بھی بورژوا طبقہ اس طور پر بلا شرکت غیرے سیاسی اقتدار پر قابض نہیں ہوسکتا جس طرح جاگیرداری اشرافیہ قرون وسطی میں اس پر قابض رہا تھا — کم از کم زیادہ مدت کے لئے تو بورژوا طبقہ ایسا کر نہیں سکتا ۔ فرانس تک میں ، جہاں جاگیرداری کا بالکل ہی قلع قمع ہو چکا تھا ، مجموعی طور پر بورژوا طبقہ ہر دفعہ صرف بہت ہی قلیل مدت کے لئے حکومت پر پوری طرح قابض رہ سکا ہے ۔ لوئی فلپ کے دور حکومت میں — ۱۸۳۰ ء سے ۱۸۴۸ ء تک — بورژوا طبقے کا ایک بہت ہی چھوٹا حصہ سلطنت کرتا تھا اور اس کی بہت بڑی اکثریت حق رائے دہندگی پر بہت اونچی شرائط ہونے کے باعث اس سے محروم تھی ۔ دوسری ریپلک کے زمانے میں — ۱۸۴۸ ء سے ۱۸۵۱ ء تک — پورے بورژوا طبقے کی حکومت تھی لیکن صرف تین سال کے لئے ۔ ان کی نااہلی کے سبب دوسری سلطنت معرض وجود میں آ گئی ۔ اور یہ صرف اب ، تیسری ریپلک کے وقت میں ہی ہو سکا ہے کہ بیس سال سے زائد سے عنان حکومت پورے بورژوا طبقے کے ہاتھ میں ہے ، مگر اس میں ابھی سے انحطاط کے بھرپور آثار نظر آنے لگے ہیں ۔ بورژوا طبقے کی پائدار حکومت تو صرف امریکہ ہی جیسے ملکوں میں ممکن ہو سکی ہے جہاں جاگیرداری ہمیشہ سے ناپید تھی اور سماج کا قیام شروع ہی سے بورژوا بنیادوں پر ہوا تھا ۔ اور فرانس اور امریکہ تک میں بورژوا طبقے کے جانشین ، محنت کش عوام ، ابھی سے دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں ۔

انگلستان میں بورژوا طبقے کو کبھی بھی مکمل اقتدار حاصل نہیں ہوا ۔ ۱۸۳۲ ء کی فتح کے بعد بھی سارے سرکاری ادارے تقریباً مکمل طور پر جاگیرداری اشرافیہ کے قبضے میں رہے ۔ دولت‌مند

متوسط طبقے نے جس مسکینی کے ساتھ اس صورت حال کے سامنے سر جھکا دیا تھا وہ میرے لئے اس وقت تک بالکل ناقابل تصور تھی، جب تک کہ ایک بڑے لبرل کارخانہ‌دار مسٹر ولیم فارسٹر نے اپنی ایک پبلک تقریر میں یہ کہہ کر بریڈفورڈ کے نوجوانوں کو فرانسیسی زبان سیکھنے کی پراصرار ہدایت نہیں کی کہ وہ ان کی دنیوی ترقی کا ایک وسیلہ ہے اور اس نے اس سلسلے میں اپنا تجربہ پیش کیا کہ جب اسے وزیر کابینہ کی حیثیت سے ان سماجی حلقوں سے رسم و راہ رکھنی پڑتی تھی جن کے یہاں فرانسیسی زبان کم از کم انگریزی جتنی ضروری چیز تھی، تو وہ کس قدر کھسیایا ہوا دکھائی دیتا تھا! واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے کا انگریز متوسط طبقہ عام طور پر بالکل جاہل نودولتیوں پر مشتمل تھا اور اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ ان بہتر اور اونچی قسم کے حکومتی عہدوں کو اشرافیہ کے لئے چھوڑ دے جن کے واسطے محض کنویں کے مینڈک کی سی تنگ‌نظری اور خودپسندی جس میں کاروباری *

---

* اور کاروباری معاملات میں بھی قومی عصبیت (Chauvinism) بہت ہی فضول صلاح‌کار ثابت ہوتی ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے تک ایک اوسط انگریز کارخانہ‌دار اس چیز کو بہت کسرشان سمجھتا تھا کہ کوئی انگریز اپنی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان بولے اور وہ اس چیز پر نازاں بھی تھا کہ ”بچارے،، بدیسی انگلستان میں آ کر بس گئے تھے اور انھوں نے اسے اپنی پیداوار کو باہر کی منڈیوں میں کھپانے کی مصیبت سے نجات دلا دی تھی۔ اس نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ اس طرح ان بدیسیوں نے، جن میں زیادہ تر جرمن تھے، برطانیہ کی بیرونی تجارت کے درآمد اور برآمد کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا اور انگریزوں کی تجارت تقریباً تمام‌تر نوآبادیوں اور چین، ریاست‌ہائے متحدہ اور جنوبی امریکہ تک محدود ہو گئی تھی۔ اسی طرح اس نے اس امر پر بھی کوئی توجہ نہیں کی کہ یہ جرمن باہر کے جرمنوں کے ساتھ تجارت کرتے تھے جنھوں نے دھیرے دھیرے تمام دنیا میں تجارتی نوآبادیات کا ایک جال سا بچھا دیا تھا۔ لیکن جب تقریباً چالیس سال ادھر جرمنی

تیزفہمی کی تھوڑی سی چاشنی بھی ہو ، کافی نہیں ہے ، بلکہ اور دوسری اہلیتوں کی ضرورت ہے ۔ اب بھی متوسط طبقے کی تعلیم کے متعلق اخباروں میں جو لامتناہی بحث مباحثے ہوتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز متوسط طبقہ اب تک خود کو بہترین تعلیم کے قابل نہیں سمجھتا اور کسی اس سے کم درجہ چیز کی تلاش کرتا ہے ۔ چنانچہ اناج کے قوانین کی تنسیخ کے بعد بھی اس جنز کو بالکل ٹھیک اور مناسب سمجھا گیا کہ وہ لوگ جنھوں نے یہ معرکہ سر کیا تھا — یعنی کوبڈن ، برائٹ اور فارسٹر وغیرہ — ملک کی سرکاری حکومت میں حصہ لینے سے محروم رہیں — تاوقتیکہ بیس سال بعد ایک نیا قانون اصلاحات (۳۴) ان کے لئے کابینہ کے دروازے وا نہ کر دے ۔ انگریز بورژوا طبقے کو آج تک اپنی سماجی کم مائگی کا اس قدر شدید احساس ہے کہ اس نے اپنے اور قوم کے خرچ پر محض آرائشی احدیوں کی ایک پوری فوج رکھ چھوڑی ہے جو تمام ریاستی تقریبوں میں قوم کے شایان شان نمائندگی کرتی ہے ، اور بورژوا طبقے کے لوگوں میں سے اگر کوئی اس منتخب اور برگزیدہ جماعت میں شامل ہونے کا اہل سمجھا جاتا ہے ، جس کی خود انھوں نے ہی تخلیق کی ہے ، تو پورا طبقہ اس کو اپنی بڑی عزت افزائی سمجھتا ہے ۔

نے سنجیدگی سے برآمد کے لئے مصنوعات تیار کرنی شروع کیں تو اسے اتنے مختصر سے عرصے میں اناج کی برآمد کرنے والے ملک سے اول درجے کے صنعتی ملک بننے میں نوآبادیوں کے اس جال سے بہت زیادہ مدد ملی ۔ تب ، تقریباً دس سال ادھر ، برطانوی کارخانہ دار گھبرانے لگا اور اس نے اپنے سفیروں اور قونصلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ آخر اس کے خریدار اب اس کے ہاتھ سے کیوں نکلے جا رہے ہیں ؟ سب یکزبان ہو کر جواب دیتے تھے : (۱) تم خود اپنے خریدار کی زبان نہیں سیکھتے ہو بلکہ اس سے توقع کرتے ہو کہ وہ تمھاری زبان سیکھے ، (۲) اور یہی نہیں بلکہ تم تو اپنے خریدار کی ضروریات ، عادتوں اور مذاق سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے ، بلکہ اس سے توقع کرتے ہو کہ وہ تمھاری انگریزی عادات ، ضروریات اور مذاق کو اپنائے ۔ (اینگلس کا نوٹ)

تو گویا صنعتی اور تجارتی متوسط طبقے نے زمیں‌دار اشرافیہ کو سیاسی اقتدار سے پوری طرح نکالا بھی نہیں تھا کہ ایک اور مدمقابل ، مزدور طبقہ ، منظر پر نمودار ہو گیا۔ چارٹسٹ تحریک اور یورپی انقلابوں کے بعد کی رجعت پسندی نے اور اس کے علاوہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۶۶ء تک انگریزی تجارت کی غیرمعمولی توسیع نے (جسے عامیانہ طریقے سے صرف آزاد تجارت کا مرہون منت سمجھا جاتا ہے لیکن جو دراصل اس سے کہیں زیادہ ریلوں ، بحری جہازوں اور عموماً سبھی ذرائع آمد و رفت کی شان‌دار توسیع و ترقی کی شرمندۂ احسان ہے) ایک دفعہ پھر مزدور طبقے کو لبرل پارٹی کا محتاج بنا دیا تھا جس کا وہ چارٹسٹ زمانے سے پہلے کی طرح اب بھی ریڈیکل بازو تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ مزدوروں کی حق رائے دہندگی کی مانگ کو ٹالنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اور جبکہ لبرل پارٹی کے "وھگ"، (۳۵) لیڈروں نے "بزدلی"، دکھائی تو ڈزرائیلی نے "ٹوریوں"، (۳۶) کو ٹھوکے دے دے کر ان سے صحیح اور مناسب موقع پر نشستوں کی نئی تقسیم کے ساتھ بلدیوں (boroughs) میں رہائشی مکان رکھنے والے خاندان کے حق رائے دہندگی کی بنا بھی ڈلوا دی اور اس طرح وھگ لیڈروں پر اپنی فوقیت ثابت کر دی۔ اس کے بعد پوشیدہ رائے دہندگی شروع ہوئی۔ پھر ۱۸۸۴ء میں خاندان کے حق‌رائے دہندگی کو بڑھا کر اس کا اطلاق اضلاع بلدہ (کاؤنٹی) پر بھی ہونے لگا اور نشستوں کی ایک اور تقسیم نو عمل میں لائی گئی جس کی وجہ سے انتخابی اضلاع میں کسی حد تک مساوات قائم ہو گئی۔ ان سب تدابیر نے خاصی بڑی حد تک مزدور طبقے کی انتخابی طاقت کو بڑھایا ، یہاں تک کہ آج کم از کم ڈیڑھ ، دو سو انتخابی حلقوں میں رائے دہندوں کی اکثریت مزدور طبقے پر مشتمل ہے۔ لیکن پارلیمانی طرز حکومت روایات کا احترام سکھانے کے لئے بہترین تعلیم گاہ ہے۔ جب متوسط طبقہ اس طبقے کو جسے لارڈ جان مینرس مذاق میں "ہمارا پرانا اشرافیہ"، کہتا تھا ، رعب و احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا تھا ، اس وقت محنت کش عوام اس طبقے کو جسے "ان سے بالاتر"، کہا جاتا تھا — یعنی متوسط طبقے کو — اسی طرح عزت و تعظیم کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ پندرہ

سال ادھر تک برطانوی مزدور مثالی مزدور تھا جس کا حفظ مراتب کا خیال ، اپنے آقا کے مرتبے کا احترام اور اپنے حقوق منوانے کے سلسلے میں جس کا ضبط و اعتدال — یہ چیزیں ہمارے '' کتھیڈر سوشلسٹ ،، (Katheder — Socialist) (۳۷) مدرسۂ خیال کے پیرو جرمن ماہرین معاشیات کے آنسو پونچھ دیتی تھیں جو خود اپنے ہم‌قوم مزدوروں کے ناقابل علاج کمیونسٹ اور انقلابی رجحانات سے نالاں تھے۔

لیکن انگریز متوسط طبقے کے لوگ — جو بڑے اچھے کاروباری ہوتے ہیں — جرمن پروفیسروں سے زیادہ دوربین تھے ، انھوں نے محض بدرجۂ مجبوری مزدور طبقے کو اپنے اقتدار میں شریک کیا تھا — انھوں نے چارٹسٹ زمانے میں دیکھ لیا تھا کہ یہ '' ھٹا کٹا لیکن بدباطن لڑکا ،، — یعنی عوام — کیا کچھ کرسکتا ہے اور اس کے بعد سے وہ حقوق‌نامۂ عوام کے زیادہ‌تر حصے کو سلطنت متحدہ برطانیہ کے تحریری قوانین میں شامل کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اب تو ہمیشہ سے بھی زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ عوام کو اخلاقی ذرائع سے قابو میں رکھا جائے اور ان تمام اخلاقی ذرائع میں جن کی مدد سے عوام پر اثر ڈالا جاتا ہے مذہب ہمیشہ سے اولین اور سب سے زیادہ موثر حربہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہی سبب تھا اسکول بورڈوں میں پادریوں کی اکثریت کا ، اور یہی سبب تھا کہ رسوم‌پرستی (۳۸) سے لے کر نجات‌فوج تک ہر قسم کی احیائے مذہب کی تحریکوں کو مدد پہنچانے کے لئے بورژوا طبقے نے روزافزوں طور پر اپنے اوپر ٹیکس لگایا۔

اور اب یورپی بورژوا کی معقول‌پسندی اور مذہب کی طرف سے بے پروائی پر برطانوی سفیدپوشوں کی فتح کا وقت آیا۔ فرانس اور جرمنی کے مزدور باغی ہو گئے تھے۔ وہ سوشلزم کی بیماری کا بری طرح شکار ہو چکے تھے اور — خاصی معقول وجوہ کی بنا پر — انھیں اس چیز کی قطعی فکر نہیں تھی کہ اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے وہ جو ذرائع اختیار کریں وہ قانونی ہی ہوں۔ اس موقع پر وہ ھٹا کٹا لڑکا روز بروز زیادہ بدباطن ہوتا گیا۔ فرانسیسی اور جرمن بورژوا طبقے کے لئے بس ایک یہی آخری چارۂ کار رہ گیا تھا کہ وہ خاموشی سے اپنی معقول‌پسندی کو خیرباد کہہ دے ، جس طرح ایک نوعمر لڑکا ، جو بڑی شان سے اکڑتا ہوا اپنا جلتا ہوا سگار لے کر

جہاز پر آتا ہے، متلی اور دوران سر شروع ہوتے ہی خاموشی سے سگار گرا دیتا ہے۔ مذہب کی تضحیک کرنے والوں نے ایک ایک کر کے مذہبی جامہ پہن لیا اور چرچ کا اور اس کے عقیدوں اور رسوم کا احترام سے ذکر کرنے لگے۔ اور تو اور وہ اس حد تک ان رسوم کی پابندی بھی کرنے لگے جس کے بغبر گزارہ نہیں تھا۔ فرانسیسی بورژوا جمعے کے دن گوشت کھانے سے پرہیز کرنے لگا اور جرمن بورژوا اتوار کے روز اپنی گرجا کی نشست پر بیٹھ کر لمبے لمبے پروٹسٹنٹ وعظ سننے لگا۔ فلسفۂ مادیت کے ہاتھوں انہوں نے زک اٹھائی تھی۔ «Die Religion muss dem Volk erhalten werden» — مذہب کو عوام کے لئے زندہ رکھنا چاہئے — یہ سماج کو مکمل تباہی سے بچانے کا واحد اور آخری ذریعہ تھا۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کو یہ نکتہ اس وقت تک نہیں سوجھ سکا جب تک کہ وہ مذہب کو کمزور کرنے کے لئے اپنی تمام‌تر بہترین کوششیں صرف نہیں کر چکے۔ اور اب برطانوی بورژوا کے پھبتی کسنے کرنے کی اور یہ کہنے کی باری آئی ''احمقو، میں تو تمہیں دو سو سال پہلے ہی یہ گر سکھا سکتا تھا!،،

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نہ تو برطانوی بورژوا کا مذہبی اڑیل‌پن اور نہ ہی یورپی بورژوا کی بعد ازوقت (post festum) تبدیلیٔ عقائد پرولتاری دھارے کو روکنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ پرانی لکیر پیٹنا تاخیر اور سست‌رفتاری پیدا کرنے والی ایک اہم قوت ہے، وہ تاریخ کی جامدوساکن طاقت (vis inertiae) ہے، لیکن چونکہ وہ محض ایک مفعولی قوت ہے اس‌لئے کبھی نہ کبھی ضرور توڑ دی جائے گی، اور اس طرح مذہب سرمایہ‌داری سماج کا لازوال پشت‌پناہ نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی سماج میں ہمارے قانونی، فلسفیانہ اور مذہبی خیالات ونظریات اس سماج میں رائج‌وموجود معاشی تعلقات کا کم‌وبیش دور یا نزدیک کا نتیجہ ہیں تو ان تعلقات میں ایک مکمل تبدیلی واقع ہونے کی صورت میں وہ آخرکار اس تبدیلی کے اثرات اور نتائج سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اگر ہم مافوق‌الفطری الہام و وحی پر اعتقاد رکھتے ہوں تو الگ بات ہے ورنہ ہمیں تسلیم کرنا ہی پڑے‌گا کہ کوئی مذہبی اصول و عقائد ایک گرتے ہوئے سماج کی عمارت کو تھامنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ انگلستان میں بھی ایک دفعہ پھر محنت کشوں

میں زندگی کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ طرح طرح کی روایات میں جکڑے ہوئے ہیں — ایک طرف بورژوا روایات ہیں، مثلاً یہ عام عقیدہ کہ دو پارٹیوں — قدامت پرست (Conservative) اور آزادخیال (Liberal) پارٹیوں — کے علاوہ اور کوئی تیسری جماعت ہو ہی نہیں سکتی اور مزدور طبقے کو عظیم لبرل پارٹی کے وسیلے اور توسط سے ہی اپنی مکتی تلاش کرنی ہوگی۔ اور دوسری طرف محنت کشوں کی روایات ہیں جو ان کی آزادانہ اور بطور خود میدان عمل میں کودنے کی آزمائشی کوششوں کا ورثہ ہیں، مثلاً بہت سی پرانی مزدور سبھاؤں (ٹریڈ یونینوں) میں ان تمام امیدواروں کا داخلہ بند ہونا جو باقاعدہ شاگردی کے دور سے نہیں گزرے ہیں اور اس طرح ہر ایسی مزدور سبھا میں اس کے اپنے غدار ہڑتال توڑ مزدوروں کا پیدا ہونا اور پروان چڑھنا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انگریز مزدور طبقہ برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ جیسا کہ خود پروفیسر برنتانو کو رنج و افسوس کے ساتھ اپنے روحانی بھائیوں ''کتھیڈر سوشلسٹوں،، کو بتانا پڑا تھا۔ انگریز مزدور طبقہ، انگلستان کی اور تمام چیزوں کی طرح دھیرے دھیرے اور نپے تلے قدموں سے آگے بڑھ رہا ہے، اس کے یہاں کہیں جھجک اور تامل ہے تو کسی جگہ کچھ آزمائشی قسم کی، کم و بیش بےثمر اور بےنتیجہ کوششیں ہیں۔ یہ کبھی کبھی سوشلزم کے نام سے انتہائی محتاط قسم کی بداعتقادی دکھاتا ہوا آگے بڑھتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ سوشلزم کے جوہر کو جذب بھی کرتا جاتا ہے۔ یہ تحریک بڑھ رہی ہے اور یکے بعد دیگرے مزدوروں کے مختلف حصوں کو اپنی گرفت میں لا رہی ہے۔ اب اس نے لندن کے ''مشرقی محلے،، (East End) (۳۹) کے اونگھتے ہوئے غیرهنرمند مزدوروں کو بھی جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ ان نئی قوتوں نے اس کے عوض اس تحریک کو کیسی تڑپ اور توانائی عطا کی ہے۔ اگر اس تحریک کی رفتار بعض بےصبر لوگوں کے نزدیک کافی تیز نہیں ہے تب بھی انہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ مزدور طبقے ہی نے انگریزی کردار کی بہترین خصوصیات کو زندہ رکھا ہے، اور انہیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ انگلستان

میں جب ایک بار ترقی کی راہ میں کوئی قدم اٹھا لیا جاتا ہے تو پھر وہ عام طور پر پیچھے نہیں ہٹتا۔ اگر چارٹزم کے پرانے علم برداروں کے بیٹے – ان وجوہ کی بنا پر جن کی اوپر تشریح کر دی گئی ہے – ان کے معیار پر پورے نہیں بھی اترے تو ان کے پوتوں کی ہونہاری تو صاف بتا رہی ہے کہ وہ اپنے اجداد کے سپوت ثابت ہوں گے۔

لیکن یورپ کے مزدور طبقے کی فتح کا انحصار صرف انگلستان ہی پر نہیں ہے۔ اس کے حصول کے لئے کم از کم انگلستان، فرانس اور جرمنی کا تعاون لازمی شرط ہے (۴۰)۔ فرانس اور جرمنی دونوں ملکوں میں مزدور طبقے کی تحریک انگلستان سے کہیں آگے ہے۔ اور جرمنی میں تو تحریک کامیابی سے کچھ ایسی بہت دور نہیں رہ گئی ہے۔ اس نے پچھلے پچیس سال میں وہاں جو ترقی کی ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ تحریک روزافزوں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ اگر جرمن متوسط طبقے نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ افسوسناک حد تک سیاسی صلاحیت، ڈسپلن، ہمت، زور و توانائی اور مستقل مزاجی سے محروم ہے تو دوسری طرف جرمن مزدور طبقے نے ان ساری صفات کا حامل ہونے کے فراواں ثبوت دے دئے ہیں۔ چار سو سال پہلے جرمنی یورپ کے متوسط طبقے کے پہلے انقلاب کا نقطۂ آغاز تھا، اور اب جو حالات ہیں ان کے پیش نظر کیا یہ چیز بالکل خارج از ممکنات ہے کہ جرمنی یورپ کے پرولتاری طبقے کی پہلی عظیم فتح کا گہوارہ بھی ہو؟

۲۰ اپریل ۱۸۹۲ء

فریڈرک اینگلس

یہ مقدمہ سب سے پہلے اینگلس کی تصنیف «Socialism Utopian and Scientific» کے ساتھ شائع ہوا جو لندن میں ۱۸۹۲ء میں چھپی تھی۔ بیک وقت رسالہ «Die Neue Zeit» کے ۱۸۹۱ء – ۱۸۹۲ء کے شماروں میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔

ترجمہ ۱۸۹۲ء کی انگریزی اصل کے مطابق کیا گیا۔

یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم

ا

عہد جدید کا سوشلزم بنیادی طور پر ایک طرف تو ان طبقاتی مخالفتوں کے شعور کی دین ہے جو موجودہ سماج میں ملکیت‌داروں اور محروم ملکیت افراد کے درمیان، سرمایہ‌داروں اور اجرتی مزدوروں کے درمیان پائی جاتی ہیں اور دوسری طرف وہ دین ہے پیداوار میں نراج کی۔ لیکن اپنی نظریاتی شکل میں جدید سوشلزم سب سے پہلے ظاہر بظاہر ان اصولوں کی ایک زیادہ منطقی توسیع کی طرح نمودار ہوتا ہے جن کی بنیاد اٹھارھویں صدی کے عظیم فرانسیسی فلسفیوں نے رکھی تھی۔ ہر نئے نظرئے کی طرح جدید سوشلزم کو بھی شروع میں اپنا تعلق اس عقلی سرمائے سے قائم کرنا پڑا جو اس وقت تیار موجود تھا، باوجودیکہ اس کی جڑیں مادی معاشی حالات میں بہت گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔

وہ عظیم انسان جنھوں نے فرانس میں لوگوں کے ذہنوں کو آنے والے انقلاب کے لئے تیار کیا تھا خود شدت پسند انقلاب‌پرست تھے۔ وہ کسی بھی قسم کے خارجی اقتدار کو نہیں مانتے تھے۔ مذہب، علوم طبیعی، سماج، سیاسی ادارے — ہر چیز کو تیز اور کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا: ہر چیز کے لئے ضروری تھا کہ وہ عقل کی کرسیٔ عدالت کے حضور میں اپنے وجود کا جواز پیش کرے ورنہ اپنے وجود ہی سے دست بردار ہو جائے۔ عقل ہر چیز کا واحد پیمانہ بن گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہیگل کے الفاظ میں دنیا سر کے

بل کھڑی تھی *۔ اول تو اس معنی میں کہ انسانی سر (ذہن) اور اس کے فکر سے پیدا ہونےوالے اصول تمام انسانی افعال اور تعلقات کی بنیاد ہونے کا دعوی کرتے تھے ، لیکن رفتہ رفتہ اس دوسرے وسیع تر معنی میں بھی کہ حقیقت کو ، جو ان اصولوں کے برعکس تھی ، واقعی الٹ دیا گیا تھا۔ سماج اور حکومت کی ہر اس شکل کو جو اس وقت موجود تھی اور تمام پرانے روایتی خیالات کو خلاف عقل کہہ کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا تھا ، اس وقت تک دنیا نے خود کو صرف تعصبات کی قیادت میں دے رکھا تھا ، ماضی کی تمام چیزیں صرف قابل رحم اور قابل تحقیر تھیں۔ اب پہلی دفعہ دن کی روشنی ،

---

* یہ ٹکڑا انقلاب فرانس کے متعلق ہے : " قانون کے تصور اور فہم نے یکبارگی اپنے وجود کو محسوس کرایا اور ان کے مقابلے میں باطل کا پرانا ڈھانچہ کھڑا نہیں رہ سکا۔ لہذا اس تصور قانون کی روشنی میں اب ایک آئین بن گیا ہے اور اب سے ہر چیز کی بنیاد اسی پر ہونی چاہئے۔ جب سے سورج فضائے سماوی میں موجود ہے اور سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں ، یہ نظارہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ انسان سر کے بل — یعنی خیال پر — کھڑا ہو اور اس خیال کے مطابق حقیقت کی تشکیل کرے۔ پہلے انکساگورس نے کہا تھا کہ Nous یا عقل دنیا پر حکومت کرتی ہے ، لیکن اب پہلی دفعہ انسان نے یہ بات مانی کہ خیال کو ذہنی حقیقت پر حکومت کرنی چاہئے۔ اور یہ ایک شاندار طلوع آفتاب تھا۔ تمام سوچنے والی ہستیوں نے اس مبارک اور مقدس دن پر خوشیاں منانے میں حصہ لیا۔ اس وقت انسان پر ایک لطیف و پاکیزہ جذبہ طاری و ساری ہو گیا تھا۔ دنیا پر ایک جوش خرد چھایا ہوا تھا گویا اس وقت " قانون الہی " میں اور دنیا میں صلح ہوگئی تھی۔ " (ہیگل : " فلسفۂ تاریخ " ، ۱۸۴۰ء ، صفحہ ۵۳۵۔) کیا اب وقت نہیں آگیا ہے کہ مرحوم پروفیسر ہیگل کی ان مخرب و باغیانہ اور اجتماعی خطرے کی حامل تعلیمات کے خلاف سوشلسٹ دشمن ہنگامی قانون (۲۱) لاگو کر دیا جائے ؟ (اینگلس کا نوٹ)

عقل کی سلطنت، نمودار ہوئی تھی۔ اب سے توہمات، ناانصافی، مخصوص مراعات اور ظلم و جبر کی جگہ ابدی صداقت، ابدی حق، فطرت پر مبنی مساوات اور اٹل انسانی حقوق کی حکمرانی ہوگی۔

آج ہم جانتے ہیں کہ یہ عقل کی سلطنت بورژوا طبقے کی نام‌نہاد مثالی سلطنت سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی، ہم جانتے ہیں کہ اس ابدی حق کی تعبیر تھی بورژوا عدل، اور یہ مساوات قانون کے سامنے بورژوا مساوات سے زیادہ اور کسی معنی کی حامل نہیں تھی، ہم جانتے ہیں کہ بورژوا ملکیت کے لئے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ وہ انسان کے بنیادی حقوق میں سے ایک ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عقل کی حکومت، روسو کا معاہدۂ عمرانی (۳۲) صرف ایک جمہوری بورژوا ریپلک کی شکل میں وجود میں آیا اور صرف اسی ایک شکل میں وجود میں آ سکتا تھا۔ اپنے پیش‌رووں کی طرح اٹھارھویں صدی کے عظیم مفکر بھی ان حدود سے آگے نہیں جا سکتے تھے جو ان کے دور نے ان پر عائد کر رکھی تھیں۔

لیکن دولت‌مند شہریوں (burghers) کی، جو باقی تمام سماج کی نمائندگی کے دعوے‌دار تھے، اور جاگیردار اشرافیہ کی باہمی مخالفت کے پہلو بہ پہلو استحصالی طبقوں اور مظلوم طبقوں، دولت مند عیش کوشوں اور غریب محنت کشوں کی عام باہمی آویزش بھی تھی۔ اور ٹھیک یہی چیز تھی جس نے بورژوا طبقے کے نمائندوں کے لئے یہ امکان پیدا کر دیا کہ وہ خود کو صرف ایک مخصوص طبقے کے نہیں بلکہ تمام مصیبت‌زدہ انسانیت کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کریں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے معرض وجود میں آنے کے وقت سے ہی بورژوا طبقے کی ضد اس کے شانوں پر سوار تھی: اجرتی مزدوروں کے بغیر سرمایہ‌داروں کا وجود ممکن نہیں ہے اور جس تناسب سے عہد وسطی کے گلڈ (Guild) * کے استاد کاریگر عہد جدید کے بورژوا طبقے میں تبدیل ہوئے اسی تناسب سے گلڈ کے اجرت‌یافتہ کاریگر اور گلڈ سے باہر کے روزانہ کام کرنے‌والے مزدور پرولتاری طبقے میں تبدیل

---

* قرون وسطی میں یورپ میں ہم پیشہ دستکاروں کی انجمن۔ (ایڈیٹر)

ہوتے گئے ۔ اور گو بورژوا طبقہ ، مجموعی طور پر ، اشرافیہ کے خلاف اپنی کشمکش کے دوران میں اس زمانے کے مختلف محنت کش طبقوں کے مفاد کی نمائندگی کا بھی دعوی کر سکتا تھا ، لیکن ہر عظیم بورژوا تحریک میں اس طبقے کی ، جو عہدجدید کے پرولتاریہ کا کم‌وبیش ترقی‌یافتہ پیش‌رو تھا ، اپنی الگ اور آزادانہ تحریکیں ضرور پیدا ہوجاتی تھیں ۔ مثلاً جرمن اصلاح دین اور کسانوں کی جنگ کے زمانے میں اناپٹسٹ (۴۳) اور تھومس مونتسر ، عظیم انقلاب انگلستان کے دوران میں لیویلر (۴۴) اور عظیم انقلاب‌فرانس میں بابیف ۔

اس طبقے کی ، جو اب تک پوری طرح ترقی‌یافتہ نہیں تھا ، انقلابی بغاوتوں سے مطابقت رکھتے ہوئے نظری دعوے بھی موجود تھے — مثلاً سولھویں اور سترھویں صدیوں میں مثالی سماجی حالات کی یوٹوپیائی تصویریں (۴۵) اور اٹھارھویں صدی میں خود کمیونسٹ نظرئے (موریلی اور مابلی) ۔ اب مساوات کا مطالبہ صرف سیاسی حقوق تک محدود نہیں رہا تھا ، اس نے پھیل کر افراد کے سماجی حالات کو بھی احاطہ کر لیا تھا ۔ صرف طبقاتی مراعات ھی کا نہیں بلکہ خود طبقاتی امتیازات کا انسداد ہونا تھا ۔ ایک رہبانیت‌پسند اور اسپارٹائی قسم کا کمیونزم جو زندگی کے تمام عیش و تفریح کے خلاف تھا نئی تعلیمات کی اولین شکل تھا ۔ اس کے بعد تین عظیم یوٹوپیائی آئے : سین سائموں ، جس کے لئے پرولتاری تحریک کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے کی تحریک اب تک ایک خاص اهمیت رکھتی تھی ، فورئے اور اووین ، جس نے اس ملک میں ، جہاں سرمایہ‌دارانہ پیداوار سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ تھی ، اور اس صورت حال سے پیدا ہونے والے تضادوں کے زیراثر ، باضابطہ طور پر طبقاتی امتیاز کو ختم کرنے کے سلسلے میں اپنی وہ تجاویز مرتب کیں جن کا فرانسیسی مادیت سے براہ‌راست تعلق تھا ۔

ایک چیز ان تینوں میں مشترک ہے — ان میں سے ایک بھی اس پرولتاریہ کے مفاد کے نمائندے کی حیثیت سے سامنے نہیں آتا جسے اس دوران میں تاریخی ارتقا نے جنم دے دیا تھا ۔ فرانسیسی فلسفیوں کی طرح وہ بھی یہ دعوی نہیں کرتے کہ شروع میں وہ ایک خاص طبقے کو آزادی دلائیں‌گے بلکہ ایک دم پوری انسانیت کو آزاد کرانے کا دعوی کرتے ھیں ۔ انہیں کی طرح وہ بھی عقل کی سلطنت

اور ابدی عدل کو بروئےکار لانے کے خواہش‌مند ہیں لیکن اس سلطنت کا جو تصور ان کے سامنے ہے اس میں اور فرانسیسی فلسفیوں کے تصور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ ہمارے ان تین سماجی مصلحوں کی نظر میں ان فلسفیوں کے اصولوں پر مبنی بورژوا دنیا اسی قدر خلاف عقل اور خلاف انصاف ہے جتنا کہ جاگیرداری اور اس سے پہلے کے اور تمام سماجی دور ہیں، لہذا اسی قدر آسانی سے وہ بھی کوڑے کے ڈھیر پر جگہ پا جاتی ہے۔ اگر دنیا پر اب تک عدل اور عقل محض کی حکمرانی نہیں ہوئی ہے تو اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے ان دونوں چیزوں کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا تھا۔ بس ایک صاحب فکر و نظر کی ضرورت تھی جو اب نمودار ہو گیا ہے اور جو صداقت کو سمجھتا ہے۔ یہ چیز کہ اب ایک ایسا فرد نمودار ہو گیا ہے، اور یہ کہ اب صداقت کو اچھی طرح سمجھ لیا گیا ہے، ایک ناگزیر واقعہ نہیں ہے جو تاریخی ارتقا کی زنجیر کی ایک لازمی کڑی ہو، بلکہ محض حسن اتفاق ہے۔ وہ آسانی سے پانچ سو سال قبل بھی پیدا ہو سکتا تھا اور اس طرح وہ انسانیت کو ان پانچ سو سالوں کی غلطیوں، کشمکشوں اور مصائب کا شکار ہونے سے بچا سکتا تھا۔

ہم نے دیکھا کہ اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی فلسفی، انقلاب کے پیش‌رو، کس طرح عقل کو ہر موجود شے کا واحد حکم مان کر اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک عقل پر مبنی حکومت اور عقل پر مبنی سماج کی نیو رکھی جانی تھی، ہر اس چیز کا جو ابدی عقل کے خلاف تھی بےرحمی سے قلع قمع کیا جانا تھا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ ابدی عقل اٹھارھویں صدی کے بورژوا بنتے ہوئے شہری کی مثالی عقل و فہم کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ انقلاب فرانس نے اس عقلیت پسند سماج اور حکومت کو عملی جامہ پہنا دیا تھا۔

لیکن نیا نظام جو پہلے حالات کے مقابلے میں نسبتاً معقول تھا مطلق طور پر مبنی بہ عقل ثابت نہیں ہوا۔ عقل کی بنیاد پر قائم‌شدہ ریاست کی عمارت بالکل ہی ڈھے گئی۔ روسو کے معاہدۂ عمرانی کو دہشت‌گردی میں عملی شکل ملی۔ اس دہشت‌گردی سے بورژوا طبقے نے، جو خود اپنی سیاسی اہلیت پر یقین کھو بیٹھا تھا، پہلے

تو مجلس نظما (Directorate) (۴۶) کی رشوت خوری اور بے ایمانی سیں اور آخرکار نپولینی مطلق العنانی کے زیرسایہ پناہ لی۔ موعودہ ابدی امن مسلسل غاصبانہ جنگ میں تبدیل ہوگیا۔ عقل کی بنیاد پر قائم‌شدہ سماج کا حشر بھی اس سے کچھ بہتر نہیں ہوا۔ غریب اور امیر کے درمیان جو مخالفت تھی اور جسے گلڈ اور دوسری مخصوص مراعات نے کسی حد تک کم کر رکھا تھا وہ ان کے ختم ہونے اور چرچ کے خیراتی اداروں کے بند ہو جانے سے عام خوش‌حالی میں تبدیل ہونے کے بجائے اور بھی شدید ہوگئی تھی۔ جاگیرداری زنجیروں کو توڑ کر ''ملکیت کی آزادی،، جو اب پوری طرح قائم ہو چکی تھی، چھوٹے سرمایہ‌داروں اور چھوٹے کسان ملکیت‌داروں کے لئے صرف اس بات کی آزادی ثابت ہوئی کہ بڑے سرمایہ‌داروں اور بڑے زمیں داروں کے زبردست مقابلے سے دب کر اپنی چھوٹی ملکیت کو ان بڑے ملکیت‌داروں کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ اور اس طرح جہاں تک چھوٹے سرمایہ‌داروں اور کسان ملکیت‌داروں کا تعلق ہے یہ آزادی ''ملکیت سے آزادی،، بن گئی۔ سرمایہ‌داری بنیاد پر صنعت کے ارتقا نے محنت‌کشوں کے افلاس اور بدحالی کو سماج کے وجود کی شرط بنا دیا۔ کارلائل کے الفاظ میں نقد ادائگی انسانوں کے مابین روز بروز واحد رابطہ بنتی چلی گئی۔ جرائم کی تعداد ہر سال بڑھتی ہی چلی گئی۔ پہلے جاگیرداری عیب کھلم کھلا، دن دھاڑے ہوا کرتے تھے، اب بھی گو وہ پوری طرح مٹے تو نہیں تھے لیکن کم از کم پس‌منظر میں ضرور دھکیل دئے گئے تھے۔ اور ان کی جگہ بورژوا عیب، جو اب تک چوری چھپے ہوا کرتے تھے، بڑے دھڑلے سے منظر عام پر آنے لگے۔ تجارت روزافزوں طور پر دھوکہ‌بازی بنتی چلی گئی۔ انقلابی نعرے (۴۷) کی ''اخوت،، کی تعبیر ہوئی مقابلے کی جنگ کی حیلہ‌سازیوں اور رقابتوں میں۔ تشدد کے ذریعہ ظلم و ستم کی جگہ رشوت‌ستانی وغیرہ نے لے لی، فرد کو سماج میں اونچا اٹھانے کے لئے تلوار کی جگہ سونا اہم‌ترین چیز بن گیا۔ پہلی رات کا حق جاگیرداری مالکوں سے بورژوا کارخانہ‌داروں کی طرف منتقل ہوگیا۔ عصمت‌فروشی کی وہ گرم بازاری ہوئی جو کبھی اس سے پہلے دیکھنے سننے میں نہیں آئی تھی۔ شادی اب بھی پہلے ہی کی طرح عصمت‌فروشی کی قانونی

شکل اور سرکاری پردہ بنی رہی، مزیدبرآں زناکاری کی وافر اور بھرپور فصلیں اس کے ساتھ ساتھ پھلتی پھولتی رہیں۔

مختصر یہ کہ فلسفیوں کے دلکش اور شان‌دار وعدوں کے مقابلے میں ''عقل کی فتح،، کے جنم دئے ہوئے سماجی اور سیاسی ادارے بےحد مایوس کن آڑی ترچھی لکیر ثابت ہوئے۔ بس اس مایوسی کو الفاظ کا جامہ پہنانے والے لوگوں کی کمی تھی۔ اور وہ لوگ اگلی صدی کے آغاز میں نمودار ہوگئے۔ ۱۸۰۲ء میں سین سائمون کے ''خطوط جنیوا،، شائع ہوئے۔ ۱۸۰۸ء میں فورئے کی پہلی تصنیف نمودار ہوئی، گو اس کے نظرئے کی داغ بیل تو ۱۷۹۹ء ھی میں پڑ چکی تھی۔ اور یکم جنوری ۱۸۰۰ء کو رابرٹ اووین نے نیولانارک کی قیادت کا بیڑا اٹھایا (۳۸)۔

لیکن اس زمانے تک سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور اس کے ساتھ ساتھ بورژوا اور پرولتاری طبقوں کی باھمی آویزش پورے طور پر پختہ نہیں ہوئی تھی۔ جدید صنعت سے جو کچھ ھی دن پہلے انگلستان میں شروع ہوئی تھی اب تک فرانس میں کوئی واقف بھی نہیں تھا۔ لیکن جدید صنعت ایک طرف تو ان کشمکشوں کو ہوا دیتی ھے اور تیزتر بناتی ھے، جو طریق پیداوار میں انقلاب اور طریق پیداوار کے سرمایہ‌داری کردار کے خاتمے کو لازمی بنادیتی ھیں — یہ کشمکشیں صرف ان طبقات کے مابین ھی نہیں ھوتیں جنھیں جدید صنعت نے جنم دیا ھے بلکہ یہ اس کی تخلیق کردہ تبادلے کی شکلوں اور خود پیداواری قوتوں کے درمیان بھی ھوتی ھیں۔ دوسری طرف جدید صنعت ان بہت ھی عظیم الشان پیداواری قوتوں کے اندر ان کشمکشوں کو ختم کرنے کے ذرائع بھی پیدا کر دیتی ھے۔ لہذا اگر ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ نئے سماجی نظام سے پیدا ہونے والی کشمکشوں کی تشکیل ابھی شروع ھی ہوئی تھی تو یہ بات ان کشمکشوں کو ختم کرنے کے ذرائع پر اور بھی اچھی طرح صادق آتی ھے۔ پیرس کے ''نادار،، عوام دھشت گردی کے دنوں میں لمحاتی طور پر اقتدار حاصل کر سکے، اور اس طرح بورژوا طبقے کے خلاف مرضی انھوں نے بورژوا انقلاب کو فتح کی منزل تک پہنچایا، لیکن ان کے ایسا کرنے سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اس زمانے کے حالات کے تحت ان

کا اقتدار پائدار ہونا کس قدر ناممکن تھا۔ پرولتاریہ، جس نے اس وقت پہلی مرتبہ خود کو ان ''نادار''، عوام کی سطح سے اٹھا کر ایک نئے طبقے کے مرکز میں بدیل کیا تھا، ابھی علیحدہ اور آزادانہ سیاسی عمل کے قطعی ناقابل تھا، وہ ایک مظلوم اور مصیبت‌زدہ جماعت کی حیثیت سے نمودار ہوا جو اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہیں تھی اور جسے اسی باعث حد سے حد، باہر سے یا اوپر سے مدد پہنچائی جا سکتی تھی۔

اس تاریخی صورت حال کا اثر سوشلزم کے بانیوں کے ذہنوں پر بھی تھا۔ سرمایہ‌داری طریق پیداوار کے خام اور بھونڈے حالات اور بھونڈے طبقاتی حالات سے مطابقت رکھتے ہوئے خام اور بھونڈے نظرئے بھی وجود میں آ گئے۔ یوٹوپیائی فلسفیوں نے سماجی مسائل کا حل، جو اس وقت تک ادھ کچرے معاشی حالات کے اندر چھپا ہوا تھا، انسانی دماغ کے ذریعے ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی۔ سماج میں ناانصافیوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تو ان ناانصافیوں کو دور کرنا عقل کا فرض ٹھیرا۔ سو یہ ضروری تھا کہ ایک نیا اور زیادہ کامل سماجی نظام دریافت کیاجائے اور اس نظام کو باہر سے، پرچار کے ذریعے، اور جہاں کہیں ممکن ہو مثالی تجربوں کے ذریعے سماج کے سر تھوپا جائے۔ یوٹوپیائی ہونے کی وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا تو ان نئے سماجی نظاموں کا مقدر ھی تھا۔ جتنی زیادہ تفصیل اور تکمیل کے ساتھ ان کی تشکیل اور ترتیب کی جاتی تھی اسی قدر زیادہ ناگزیر خطرہ اس بات کا تھا کہ وہ محض خیالی پلاؤ بن کر رہ جائیں‌گے۔

ایک بار یہ باتیں مان لی گئیں تو ھمیں مسئلے کے اس پہلو پر، جو اب مکمل طور پر قصۂ پارینہ بن چکا ھے، اور زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ھے۔ ھم اسے چھوٹے موٹے ھیچ مقدار ادیبوں کے لئے چھوڑ سکتے ھیں تاکہ وہ بڑی گمبھیرتا کے ساتھ ان خیالی باتوں کی بال کی کھال نکالیں اور ان کے متعلق سخن سازیاں کریں جو آج صرف ھمارے ھونٹوں پر مسکراھٹ لاتی ھیں، اور اس قسم کی 'دیوانگی''، کے مقابلے میں اپنی بے کیف‌و کم توجیہہ اور استدلال کی فوقیت پر فخر سے اپنی پیٹھ ٹھونکیں۔ رھے ھم سو ھم تو ان بے‌حد ارفع و اعلی، مکمل اور نامکمل خیالات سے بہت خوش ھوتے ھیں

جو ہر طرف اپنے وہم و خیال کے پردوں کو چیر چیر کر نکلے آتے ہیں اور جن کی طرف سے یہ کم نظر مادہ پرست (Philistines) بالکل اندھے ہیں۔

سین سائموں عظیم انقلاب فرانس کا فرزند تھا، جس کے آغاز کے وقت وہ تیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا۔ انقلاب "تیسرے طبقے" (۳۹) کی فتح تھی یعنی مخصوص مراعات رکھنے والے بیکار طبقات، اشرافیہ اور پادریوں کے مقابلے میں عوام کی اکثریت کی فتح جو پیداوار یا تجارت میں کام کرتے تھے۔ لیکن تیسرے طبقے کی فتح نے جلد ہی اپنے آپ کو اس شکل میں دکھا دیا کہ وہ اس "طبقے" کے محض ایک بہت چھوٹے سے حصے کی فتح، یا دوسرے الفاظ میں اس کے مخصوص سماجی مراعات کے حامل حصے، یعنی ملکیت دار بورژوا طبقے، کے سیاسی اقتدار حاصل کر لینے کا نام ہے۔ اور بورژوا طبقے نے واقعی انقلاب کے دوران بہت تیزی سے ترقی کی تھی جو ایک حد تک تو اشرافیہ اور کلیسا کی ان زمینوں میں سٹہ بازی کے ذریعے حاصل ہوئی، جو ضبط کر لی گئی تھیں اور بعد میں بکاؤ ہو گئی تھیں، اور ایک حد تک یہ ترقی فوجی ٹھیکوں کے ذریعے قوم کو دھوکا دے دے کر حاصل کی گئی تھی۔ یہ انہیں جعل سازوں کا اقتدار تھا جو مجلس نظما کے تحت فرانس کو تباہی اور بربادی کے گڑھے تک لے آیا تھا اور جس نے اس طرح نپولین کے اچانک انقلاب حکومت کے لئے ایک عذر مہیا کر دیا تھا۔

لہذا سین سائموں کے نزدیک تیسرے طبقے اور مراعات رکھنے والے طبقات کی باہمی مخالفت نے "محنت کشوں" اور "بیکاروں" کے مابین مخالفت کی شکل اختیار کر لی۔ بیکاروں کی فہرست میں صرف مخصوص مراعات رکھنے والے طبقات ہی نہیں تھے بلکہ وہ سب لوگ بھی شامل تھے جو پیداوار یا تجارت میں کوئی حصہ لئے بغیر محض اپنی آمدنیوں پر رہتے تھے۔ اور محنت کش محض اجرتی مزدور ہی نہیں تھے بلکہ کارخانہ دار، تاجر اور بینکر بھی اسی صف میں آتے تھے۔ یہ بات کہ بیکار لوگ ذہنی قیادت اور سیاسی اقتدار اعلی کی ساری صلاحیت کھو بیٹھے تھے، پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی تھی، اور انقلاب نے قطعی طور پر اس چیز پر مہر لگا دی تھی۔

اور یہ بات کہ محروم ملکیت طبقات اس اہلیت سے عاری تھے، سین سائموں کے خیال میں دہشت گردی کے تجربات نے ثابت کر دی تھی۔ تو پھر رہبری اور قیادت کون کرے گا؟ سین سائموں کے قول کے مطابق یہ قیادت سائنس اور صنعت کریں گی جنھیں ایک نئے مذہبی بندھن نے آپس میں باندھ رکھا تھا۔ یہ بندھن ایک لازمی طور پر صوفیانہ، بےلوچ اور کٹر کلیسائی نظام مدارج رکھنے والی ''نئی عیسائیت،، کا ہم‌معنی تھا اور یہی نئی عیسائیت مذہبی عقائد کے اس اتحاد کو بحال کر سکتی تھی جو اصلاح دین کے زمانے سے اب تک ناپید تھا۔ لیکن سائنس مرادف تھی عالموں کے، اور صنعت سب سے بڑھ کر کام کرنے والے بورژوا لوگوں، کارخانہ‌داروں، تاجروں اور بینکروں کے مرادف تھی۔ بلاشبہ سین سائموں کا خیال تھا کہ یہ بورژوا لوگ اپنے آپ کو ایک قسم کے پبلک اہل‌کاروں اور سماجی متولیوں میں تبدیل کر لیں، لیکن جہاں تک ان کا اور محنت کشوں کا باھمی تعلق ھے انھیں اپنا حا کمانہ اور معاشی اعتبار سے مخصوص مراعات والا مرتبہ برقرار رکھنا تھا۔ خصوصاً بینکروں کو قرض کے لین‌دین میں ضبط اور باقاعدگی پیدا کرکے سماجی پیداوار کی رہبری کا فرض ادا کرنا تھا۔ یہ تصور اس عہد سے مکمل طور پر ہم‌آہنگ تھا جبکہ فرانس میں جدید صنعت نے اور اس کے ساتھ ساتھ بورژوا اور پرولتاری طبقات کے درمیان اختلاف نے ابھی حال ھی میں جنم لیا تھا۔ لیکن سین سائموں خاص طور سے جس بات پر زور دیتا ھے وہ یہ ھے کہ اسے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر جس چیز سے دل‌چسپی ھے وہ سب سے زیادہ غریب اور تعداد میں سب سے بڑے طبقے کی تقدیر ھے («la classe la plus nombreuse et la plus pauvre»)

اپنے ''خطوط جنیوا،، میں بھی سین سائموں یہ تجویز پیش کرتا ھے کہ ''سب آدمیوں کو کام کرنا چاھئے،،۔ اپنی اسی تصنیف میں وہ یہ بھی اعتراف کرتا ھے کہ دہشت گردی محروم ملکیت عوام کا عہد حکومت تھا۔ ''دیکھا تم نے،، وہ ان سے کہتا ھے ''جب فرانس میں تمہارے ساتھیوں کا دور دورہ تھا تو وہاں کیا ہوا، وہ لوگ اپنے ساتھ قحط لائے۔،، لیکن یہ تسلیم کرنا کہ انقلاب فرانس ایک طبقاتی جنگ تھی اور یہ جنگ صرف اشرافیہ اور بورژوا طبقے

کے مابین ھی نہ تھی بلکہ اشرافیہ ، بورژوا طبقے اور محروم ملکیت لوگوں کے مابین تھی ، ۱۸۰۲ ء میں ایک بےحد معنیخیز اور غیرمعمولی انکشاف تھا ۔ ۱۸۱۶ ء میں وہ یہ اعلان کرتا ھے کہ سیاست علم پیداوار کا نام ھے اور پیش گوئی کرتا ھے کہ سیاست سو فیصدی معاشیات میں ضم ھوجائےگی ۔ یہ ادراک کہ معاشی حالات سیاسی اداروں کی بنیاد ھیں یہاں صرف بالکل ابتدائی شکل میں ظاھر ھوتا ھے ۔ لیکن جس چیز کا یہاں ابھی سے بہت صاف طور پر اظہار کیا گیا وہ یہ تصور ھے کہ انسانوں کےاوپر سیاسی حکومت مستقبل میں انتظام ، بندوبست اور پیداواری عمل کی دیکھ بھال میں تبدیل ھوجائےگی — دوسرے الفاظ میں '' ریاست کے خاتمے '' کا تصور تھا ، جس کے متعلق حال ھی میں اس قدر شوروغوغا مچا تھا ۔

سین سائموں ۱۸۱۴ ء میں ، اتحادیوں کے پیرس میں داخل ھونے کے فوراً ھی بعد ، اور پھر ۱۸۱۵ ء میں ''سو دن کی جنگ'' (۵۰) کے دوران میں جب یہ اعلان کرتا ھے کہ فرانس اور انگلستان کا اتحاد اور پھر ان دونوں ملکوں کا جرمنی سے اتحاد یورپ کے امن اور خوشحالی اور ارتقا کا واحد ضامن ھے تو وہ اپنے ھم عصروں پر اپنی اسی فوقیت کا ثبوت دیتا ھے ۔ ۱۸۱۵ ء میں فرانسیسیوں کے سامنے واٹرلو (۵۱) کے فاتحوں کےساتھ اتحاد کی تبلیغ کرنے کےلئے تاریخی بصیرت اور ھمت دونوں ھی کی ضرورت تھی ۔

سین سائموں میں ھمیں ایک ایسی ھمہگیر وسعت نظر ملتی ھے جس کی وجہ سے بعد کے سوشلسٹوں کے تقریباً وہ تمام نظرئے جو سو فیصدی معاشی نہیں ھیں ، سین سائموں کے یہاں دھندلے خاکوں کی شکل میں مل جاتے ھیں ۔ اور دوسری طرف ھمیں فورئے کی تعلیمات میں سماج کے موجودہ حالات کی تنقید ملتی ھے ، جو خالص فرانسیسی ڈھنگ کی اور بڑی ظریفانہ ھے ، لیکن اس کے باوجود اسی قدر بھرپور اور نکتہ رس ھے ۔ فورئے بورژوا طبقے اور اس کے انقلاب سے پہلے کے فیضان یافتہ پیغمبروں اور انقلاب کے بعد کے غرضمند قصیدہ گویوں کو خود ان ھی کے الفاظ سے شکست دیتا ھے ۔ وہ بڑی بےرحمی سے بورژوا دنیا کی مادی اور اخلاقی بستی کا پردہ فاش کرتا ھے ۔ وہ اس پستی کا مقابلہ کرتا ھے پچھلے فلسفیوں کے تابناک وعدوں سے جن میں

ایک ایسے سماج کا ذکر ہے جہاں محض عقل کی حکمرانی ہوگی ، ایک ایسی تہذیب کا تذکرہ ہے جہاں گھر گھر خوشی کے چراغ جلیں گے اور جن میں انسان بےپناہ کمال کو پہنچتا جائے گا۔ اسی طرح وہ اس پستی اور انحطاط کا مقابلہ اپنے دور کے بورژوا نظریہ سازوں کے سندر اور سنہرے الفاظ سے کرتا ہے۔ فورئیے دکھاتا ہے کہ کس طرح ہر جگہ انتہائی لن‌ترانیوں اور کھوکھلی لفاظیوں اور انتہائی پست اور دردناک حقیقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور وہ ان اونچے ، شاندار فقروں کی ٹائیں ٹائیں فش کو اپنے تیزابی ، کٹیلے طنز کا نشانہ بناتا ہے۔

فورئیے صرف نکتہ‌چین نہیں ہے۔ اس کی پرسکون اور پراطمینان فطرت نے اسے طنز نگار — بلاشبہ دنیا کے عظیم‌ترین طنزنگاروں میں سے ایک — بنا دیا ہے۔ انقلاب فرانس کے زوال کے بعد ابھرنے اور پھلنے پھولنے والی جعل سازی اور سٹہ‌بازی اور اس دوکان دارانہ ذہنیت کا جو اس زمانے کی فرانسیسی تجارت میں جاری و ساری اور اس کی نمایاں خصوصیت تھی ، فورئیے بیک وقت بہت استادی اور خوبصورتی سے نقشہ کھینچتا ہے۔ بورژوا سماج میں عورت کی حیثیت اور دونوں جنسوں کے باہمی تعلقات کی بورژوا شکل کی جو تنقید اس نے کی ہے اس میں اور بھی زیادہ استادانہ شان ہے۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے یہ اعلان کیا کہ کسی بھی سماج میں عورت کی آزادی مجموعی آزادی کی صحیح اور فطری کسوٹی ہے۔

لیکن فورئیے کی پوری عظمت اس کے سماج کی تاریخ کے تصور میں ابھرتی ہے۔ وہ تاریخ کے اس وقت تک کے ارتقا کو چار منزلوں میں تقسیم کرتا ہے — عہد وحشت ، عہد بربریت ، سرقبیلی یا پدری نظام اور عہد تہذیب۔ یہ آخری منزل آج کل کے نام‌نہاد مدنی یا بورژوا سماج کے — یعنی سولھویں صدی میں وجود میں آنے والے سماجی نظام کے — مرادف ہے۔ فورئیے ثابت کرتا ہے کہ ”عہدتہذیب ہر اس عیب کو ، جو عہد بربریت میں سادہ طور پر کیا جاتا تھا ، ایک پیچیدہ ، مبہم ، منافقانہ اور پرفریب رنگ میں رنگ دیتا ہے“۔ اور وہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ تہذیب ایک ”دائرۂ نامعقول“ میں ، ایک بھنور کی صورت میں گھومتی رہتی ہے ، ان تضادوں کے

درمیان گھومتی رہتی ہے جن کو حل کرنے کی وہ نااہل ہے اور جنہیں وہ ہمیشہ نئے سرے سے جنم دیتی رہتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ جس چیز کے حصول کی خواہش‌مند ہے، یا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے حصول کی خواہش‌مند ہے، ہمیشہ اس کے متضاد چیز تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اس طرح مثلاً ''عہد تہذیب میں افلاس خود افراط کے بطن سے پیدا ہوتا ہے''۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ فورئیے جدلیاتی طریقے کا استعمال اسی قدر استادانہ انداز سے کرتا ہے جیسے اس کا ہم‌عصر ہیگل کرتا ہے۔ انہیں جدلیات کا استعمال کرتے ہوئے وہ لامحدود انسانی تکمیل‌پذیری کے ذکر کے خلاف دلائل پیش کرتا ہے اور بحث کرتا ہے کہ ہر تاریخی منزل تغیر کا ایک چڑھاؤ کا دور ضرور ہوتا ہے اور اسی طرح ایک اتار کا دور بھی۔ اور فورئیے کل نسل انسانی کے مستقبل پر اس قول کا اطلاق کرتا ہے۔ جس طرح کانٹ نے علم طبیعی میں زمین کی لازمی اور قطعی تباہی کا تصور شامل کیا ہے اسی طرح فورئیے نے علم تاریخ کو نسل انسانی کے لازمی اور قطعی خاتمے کا نظریہ دیا ہے۔

جس وقت فرانس میں انقلاب کا طوفان پورے ملک پر آیا ہوا تھا، انگلستان میں مسلسل ایک زیادہ پرسکون لیکن اس کے باوجود اسی قدر اہم اور بڑا انقلاب ہو رہا تھا۔ بھاپ اور نئی اوزار ساز مشینیں کارخانہ‌داری کو جدید صنعت میں تبدیل کر رہی تھیں اور اس طرح بورژوا سماج کی پوری بنیاد میں ایک انقلاب لا رہی تھیں۔ کارخانہ‌داری دور کا سست رو عمل ارتقا پیداوار کا ایک ابلتا مچلتا دھارا بن گیا تھا۔ سماج روزافزوں تیزی کے ساتھ بڑے سرمایہ‌داروں اور نادار پرولتاریوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان پہلے کے مستحکم متوسط طبقے کے بجائے غیرمستحکم کاریگروں اور چھوٹے دوکان‌داروں کی ایک بڑی تعداد، جو آبادی کا سب سے زیادہ تغیرپذیر حصہ تھی، اب ایک غیرمستقل اور ڈانواں ڈول سی زندگی گذارنے لگی تھی۔

نیا طریقۂ پیداوار ابھی اپنے چڑھاؤ کے زمانے کی چوکھٹ ہی پر تھا، وہ اب تک پیداوار کا نارمل اور باقاعدہ طریقہ تھا — اس وقت کے موجود حالات کے تحت واحد ممکن طریقہ۔ لیکن اس وقت

بھی وہ کھلی ہوئی سماجی لعنتوں کو جنم دے رہا تھا — مثلاً بے گھر ، بےدر انسانوں کی ایک بڑی تعداد کا بڑے بڑے شہروں کے بدترین علاقوں میں ٹھونسا جانا ، تمام روایتی اخلاقی بندھنوں اور خاندانی تعلقات کا ڈھیلا ہو جانا ، کام کا بے اندازہ بوجھ ، خصوصاً بچوں اور عورتوں پر ، اور محنت‌کش طبقے کی پست ہمتی ، جو یکبارگی قطعی نئے حالات میں پھینک دیا گیا تھا — یعنی دیہات سے شہر میں ، زراعت سے جدید صنعت میں ، جانے بوجھے ، مستحکم حالات زندگی سے دن به دن بدلنے والے ناقابل اعتبار حالات زندگی میں۔

اس موقع پر ایک ۲۹ ساله کارخانه‌دار مصلح کی حیثیت سے سامنے آیا — ایک بچوں جیسا خوش اطوار ، معصوم اور ساده کردار کا آدمی جو اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کے چند پیدائشی رهنماؤں میں سے ایک تھا۔ رابرٹ اووین نے مادیت‌پسند فلسفیوں کی تعلیمات قبول کر لی تھیں که انسان کا کردار ایک طرف تو وراثت کی دین ھے اور دوسری طرف خود انسان کے دوران حیات میں ، اور خصوصاً اس کی نشو و نما کے زمانے میں جو اس کا ماحول ھوتا ھے اس کی دین ھے۔ اس کے طبقے کے زیاده‌تر لوگوں کو صنعتی انقلاب میں محض افراتفری اور پراگندگی ھی نظر آئی اور اس کے علاوه اگر انهوں نے اس میں کچھ دیکھا تو ”کسی کا گھر جلے کوئی آگ تاپے“ کے مصداق اس زمانے کی مشکلات سے فائده اٹھانے اور تیزی سے خوب خوب روپیه بنانے کا موقع۔ رابرٹ اووین نے صنعتی انقلاب میں اپنے محبوب نظرئے کو عملی جامه پهنانے کا اور اس طرح اس افراتفری سے نظم پیدا کرنے کا موقع دیکھا۔ وه پهلے ھی مانچسٹر کے ایک کارخانے میں پانچ سو سے زائد آدمیوں کے منتظم کی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ اس نظرئے کو آزما چکا تھا۔ ۱۸۰۰ ء سے ۱۸۲۹ ء تک اس نے ایک منتظم ساجھے دار کی حیثیت سے ، اسی نظرئے کی بنیاد پر لیکن زیاده آزادیٔ عمل کے ساتھ اسکاٹ‌لینڈ کے شهر نیولانارک کے بهت بڑے سوت بنانے کے کارخانے کا اتنی زیاده کامیابی سے انتظام کیا که تمام یورپ میں اس کی شهرت هو گئی۔ ایک ایسی انسانی آبادی کو جو شروع میں انتهائی بھانت بھانت کے اور زیاده‌تر بهت بدحال اور پست همت عناصر پر مشتمل تھی — ایسی آبادی کو جس کی

تعداد رفتہ رفتہ بڑھ کر ۲۵۰۰ ہوگئی تھی۔ اس نے ایک مثالی نوآبادی میں تبدیل کر دیا۔ ایسی نوآبادی میں جہاں شراب خوری، پولیس، مجسٹریٹ، مقدمات، غربا کی امداد کے قوانین اور خیرات کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا اور یہ سب کچھ ممکن ہوا محض لوگوں کے لئے ایسے حالات مہیا کرنے سے جو انسانوں کے شایان شان ہیں، اور خصوصاً نوخیز نسل کی تربیت میں احتیاط سے کام لینے سے۔ اووین بالک گھروں کا بانی تھا اور اس نے سب سے پہلے نیولانارک میں بالک گھر شروع کئے۔ دو سال کی عمر سے بچے وہاں جانے لگتے تھے اور وہاں وہ اتنے خوش رہتے تھے، اس قدر تفریح کرتے تھے کہ انہیں گھر واپس لے جانا مشکل ہو جاتا تھا۔ جبکہ اس کے حریف و ہمچشم اپنے مزدوروں سے دن میں تیرہ تیرہ، چودہ چودہ گھنٹے کام لیتے تھے، نیولانارک میں دن میں صرف ساڑھے دس گھنٹے کام ہوتا تھا۔ ایک دفعہ سوتی کپڑے کی صنعت میں بحران آنے کی وجہ سے چار مہینے تک کام رکا رہا تو اس کے مزدور اس تمام عرصے میں پوری اجرت پاتے رہے۔ اور ان سب باتوں کے باوجود کاروبار کی قیمت دو گنی سے زیادہ ہوگئی اور آخر تک اس کے مالکوں کو اس سے بہت اونچا منافع ہوتا رہا۔

ان سب باتوں کے باوجود اووین آسودہ خاطر نہیں تھا۔ وہ زندگی بھی جو وہ اپنے مزدوروں کے لئے بنا سکا تھا اس کے نزدیک ابھی انسانوں کے شایان‌شان زندگی نہیں تھی۔ ”لوگ میرے رحم و کرم پر تھے،، اس نے کہا۔ وہ نسبتاً بہتر حالات جو اس نے ان لوگوں کے لئے مہیا کئے تھے اب تک کردار اور ذہن کے ایک متوازن اور معقول ارتقا کے ضامن نہیں ہو سکتے تھے، اور کردار اور ذہن کی تمام صلاحیتوں کے آزادانہ استعمال کے تو اس سے بھی کم ضامن ہو سکتے تھے۔ ”لیکن اس کے باوجود اس ۲۵۰۰ انسانوں کی آبادی کا کام کرنےوالا حصہ ہر روز سماج کے لئے اتنی حقیقی دولت پیدا کر رہا تھا جتنی دولت پیدا کرنے کے لئے آدھی صدی قبل ۶ لاکھ انسانوں کی آبادی کے کام کرنےوالے حصے کی ضرورت پڑتی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ جو دولت ۲۵۰۰ آدمی صرف کر رہے

هیں اس کے اور اس دولت کے درمیان جو ۶۰۰۰۰ آدمی صرف کرتے، جو فرق تھا اس کا کیا ہوا ؟ ،، *

جواب صاف تھا۔ وہ زائد دولت اس کاروبار کے مالکوں کو ان کے لگائے ہوئے سرمائے پر ۵ فی‌صدی سود دینے کے لئے، جو ۳۰۰۰۰ پاؤنڈ سے زائد کھلے منافع کے علاوہ تھا، استعمال ہوتی تھی، اور جو چیز نیولانارک پر صادق آتی تھی اس کا اطلاق اس سے بھی زیادہ انگلستان کے تمام کارخانوں پر ہوتا تھا۔ ''اگر مشینوں نے — گو ان کا استعمال بہت نامکمل طریقے سے ہو رہا تھا — اس نئی دولت کی تخلیق نہ کی ہوتی تو نپولین کی مخالفت اور سماج کے اشرافی اصولوں کی حمایت میں ہونےوالی یورپی جنگوں کے اخراجات پورے نہیں کئے جا سکتے تھے۔ لیکن اصل میں تو یہ نئی قوت مزدور طبقے کی تخلیق کردہ تھی ،، **۔ لہذا اس نئی قوت کے ثمروں کا مالک بھی وہی تھا۔ نئی تخلیق‌شدہ عظیم الشان پیداواری قوتیں جو اب تک افراد کو دولت‌مند اور عوام کو غلام بنانے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں، اووین کو ان میں سماج کی تعمیر نو کی بنیادیں مل گئیں۔ سب کی مشترکہ ملکیت بن کر انھیں سب کی مشترکہ فلاح و بہبودی کے لئے استعمال ہونا تھا۔

اووین کا کمیونزم اس خالص کاروباری بنیاد پر قائم تھا، گویا وہ ایک طرح تجارتی حساب کتاب اور تخمینے کا نتیجہ تھا۔ اس کے کمیونزم نے آخر تک اپنا یہ عملی کردار باقی رکھا۔ مثلاً ۱۸۲۳ء میں اووین نے آئرلینڈ کی معاشی بدحالی دور کرنے کے لئے کمیونسٹ نوآبادیوں کی تجویز پیش کی اور ان کے قائم کرنے کا صرفہ، ان کے سالانہ اخراجات اور ان سے ہونے والی امکانی آمدنی کے مکمل تخمینے

---

* '' ذہن اور عمل میں انقلاب ،، نامی اپیل سے لی ہوئی عبارت، صفحہ ۲۱۔ اس میں '' یورپ کے تمام سرخ ریپبلکنوں، کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں ،، سے خطاب کیا گیا ہے، اور ۱۸۴۸ء میں اسے فرانس کی عارضی حکومت اور اس کے علاوہ '' ملکہ وکٹوریہ اور اس کے ذمہ‌دار مشیروں کے پاس ،، بھی بھیجا گیا تھا۔ (اینگلس کا نوٹ)

** نوٹ ایضاً، صفحہ ۲۲۔ (اینگلس کا نوٹ)

تیار کئے۔ اووین کے مستقبل کے صاف اور واضح منصوبے میں ساری جزویات اور ٹکنیکی تفصیلات اس قدر عملی لیاقت اور بصیرت کے ساتھ مرتب کی گئی ھیں — ان میں بنیادی نقشہ، سامنے کا منظر، پہلو کا منظر اور اوپر سے دکھائی دینے والا منظر سبھی کچھ شامل ھے — کہ ایک دفعہ اووین کا سماجی اصلاح کا طریقہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر عملی نقطۂ نظر سے تفصیلات کی ترتیب و تنظیم کے خلاف مشکل ھی سے کچھ کہا جا سکتا ھے۔

اووین کا کمیونزم کی سمت بڑھنا اس کی زندگی کا نقطۂ انقلاب تھا۔ جب تک وہ محض ایک انسان دوست رھا اس پر دولت، تعریف و تحسین اور عزت و شہرت کی بارش ھوتی رھی۔ وہ یورپ میں سب سے زیادہ مقبول شخص تھا۔ صرف اس کے اپنے طبقے کے لوگ ھی نہیں بلکہ سیاست‌داں اور شہزادے بھی پسندیدگی سے اس کی باتیں سنتے تھے۔ لیکن جب وہ اپنے کمیونسٹ نظریوں کو منظر عام پر لایا تو معاملہ ھی کچھ اور ھوگیا۔ اووین کا خیال تھا کہ سماجی اصلاح کی راہ میں تین رکاوٹیں خاص طور پر حائل ھیں: شخصی ملکیت، مذھب اور شادی کی موجودہ شکل۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ان پر حملہ کرےگا تو اسے کن چیزوں کا سامنا کرنا پڑےگا — قانون کی محافظت کھوبیٹھنا، اعلی سماجی حلقوں سے برادری باھر کیا جانا اور ساتھ ھی اپنے پورے سماجی مرتبے سے محروم ھونے پر مجبور ھو جانا۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اسے، نتائج کے خوف سے بےنیاز ھو کر، ان سب پر حملہ کرنے سے باز نہیں رکھ سکی۔ اور وھی ھوا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ وہ اعلی سوسائٹی سے ذات باھر کردیا گیا، اخباروں نے اس کےخلاف خاموشی کی سازش کرلی اور اس کے امریکہ میں کئے ھوئے کمیونسٹ تجربات نے اسے مالی لحاظ سے تباہ کردیا۔ اس حالت میں اس نے براہ‌راست مزدور طبقے کی طرف رجوع کیا اور تیس سال تک ان کے درمیان رہ کر کام کرتا رھا۔ انگلستان میں مزدوروں کے بھلے کےلئے ھر ایک سماجی تحریک اور ھر ایک معقول اقدام کا رابرٹ اووین کے نام سے گہرا تعلق ھے۔ اس نے پانچ سال کی جدوجہد کے بعد ۱۸۱۹ ء میں ایسا پہلا قانون منظور کرایا جس کی رو سے کارخانوں میں کام کرنےوالی عورتوں اور

بچوں کے کام کے اوقات کی ایک حد مقرر ہوئی۔ وہ اس پہلی کانگرس کا صدر تھا جس میں انگلستان کی ساری ٹریڈیونینیں ایک واحد عظیم ٹریڈ ایسوسی‌ایشن میں متحد ہوگئیں (۵۲)۔ اس نے ایک طرف سماج کی مکمل کمیونسٹ تنظیم کی طرف لےجانےوالی عبوری تدابیر کے طور پر پیداوار اور خردہ فروشی کےلئے امداد باہمی کی انجمنوں کی بنا ڈالی — اور اس وقت سے ان انجمنوں نے کم‌از کم اس چیز کا عملی ثبوت تو دے ہی دیا ہے کہ تاجر اور کارخانےدار سماجی لحاظ سے قطعی غیرضروری ہیں، اور دوسری طرف اس نے محنت منڈیوں کی بنیاد رکھی جہاں محنت پرچیوں کے ذریعے، جن کی اکائی صرف ایک گھنٹے کی محنت ہوا کرتی تھی، محنت کی پیداوار کا تبادلہ ہوتا تھا (۵۳)۔ یہ ادارے ناکامیابی کو اپنے جلو میں لےکر آئے تھے، لیکن وہ بہت بعد کے، پرودھوں کے تجویز کردہ، تبادلے کے بینک (۵۴) کے پیش‌رو تھے، اور ساتھ ہی اس بینک سے اس لحاظ سے قطعی طور پر مختلف بھی تھے کہ وہ تمام سماجی برائیوں کےلئے اکسیر اعظم ہونے کا دعوی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کو سماج کے ایک بہت بنیادی انقلاب کی جانب صرف ایک پہلے قدم کی حیثیت سے تجویز کیا گیا تھا۔

یوٹوپیائی طریقۂ فکر عرصۂ دراز تک انیسویں صدی کے سوشلسٹ خیالات پر حاوی رہا اور اب تک ان میں سے بعض اس کے زیراثر ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک تمام انگریز اور فرانسیسی سوشلسٹ اسے خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔ اس سے پہلے کا جرمن کمیونزم، جس میں وائٹلنگ کا کمیونزم بھی شامل ہے، اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ ان سب کے نزدیک سوشلزم مطلق صداقت، عقل اور عدل کا مظہر ہے، اور بس ایک دفعہ سوشلزم کے دریافت ہونے کی دیر ہے، پھر وہ خود اپنی طاقت کے کس بل پر تمام دنیا کو مسخر کر لےگا۔ اور چونکہ صداقت مطلق انسان کے تاریخی ارتقا اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے، اس لئے یہ چیز کہ وہ کہاں اور کب دریافت ہو محض ایک حادثاتی امر ہے۔ اس کے باوجود مطلق صداقت، عقل اور عدل مختلف مدرسہ‌ہائے فکر کے بانیوں کے یہاں مختلف ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے ہر ایک کی مخصوص قسم

کی مطلق صداقت، عدل اور عقل اس کے اپنے داخلی فہم و ادراک، حالات زندگی، علم اور ذہنی تربیت کی حدود — ان سب چیزوں سے اثرپذیر ہوتی ہے اس لئے مطلق صداقتوں کی اس کشمکش کا اور کوئی انجام ممکن نہیں ہے — سوائے اس کے کہ ان سب صداقتوں میں ایک دوسرے کے لئے مطلق کوئی جگہ نہ ہو۔ لہذا اس سے ایک اوسط درجے کے، انتخابیت‌پسند (eclectic) سوشلزم کے علاوہ اور کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی اور واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے تک انگلستان اور فرانس کے زیادہ‌تر سوشلسٹ مزدوروں کے ذہنوں پر ایک ایسے ہی سوشلزم کی حکمرانی رہی ہے۔ لہذا اس کا نتیجہ ہے ایک ایسی معجون مرکب جس میں مختلف قسم کی، بھانت بھانت کی رائیں، ایسے تنقیدی بیانات، اقتصادی نظرئیے اور مختلف فرقوں کے بانیوں کی پیش کردہ مستقبل کے سماج کی ایسی تصویریں شامل ہیں جو کم سے کم اختلافات کا باعث ہوتی ہیں، یہ ایک ایسی معجون مرکب ہے جس کے مختلف اجزائے ترکیبی کا تیکھاپن مناظرے کی بھٹی میں بڑکر جس قدر ھلکا پڑ جاتا ہے اسی قدر اس کی تیاری آسان ہو جاتی ہے۔

سوشلزم کو علمی شکل دینے کے لئے پہلے اسے ایک حقیقی بنیاد پر کھڑا کرنے کی ضرورت تھی۔

۲

اسی اثنا میں اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی فلسفے کے ساتھ ساتھ، اور اس کے بعد، نیا جرمن فلسفہ بھی ابھر چکا تھا جس کا نقطۂ عروج ہیگل تھا۔ اس کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ اس نے ایک دفعہ پھر جدلیات کو استدلال کی اعلی‌ترین شکل کی حیثیت سے اختیار کر لیا تھا۔ سارے قدیم یونانی فلسفی پیدائشی اور فطری ماھر جدلیات تھے اور ارسطو، جو ان میں سب سے زیادہ ہمہ‌داں ذہن کا مالک تھا، پہلے ہی جدلیاتی فکر کی سب سے زیادہ بنیادی شکلوں کا تجزیہ کر چکا تھا۔ نیا فلسفہ — اگرچہ اس میں بھی جدلیات کے

ممتاز علمبردار (مثلاً ڈیکارٹ اور اسپینوزا) موجود تھے — خاص طور پر انگریزی اثر کے تحت، روزافزوں اور بالکل بےلوچ طریقے پر نام‌نہاد مابعد الطبیعیاتی طریقۂ استدلال کو اپناتا گیا اور یہی طریقۂ استدلال اٹھارھویں صدی کے فرانسیسیوں کے ذہنوں پر بھی تقریباً مکمل طور پر چھایا ہوا تھا — کم از کم ان کی خاص فلسفیانہ تخلیقات میں تو ایسا ضرور تھا۔ ایک محدود معنی میں فلسفے کے باہر فرانسیسیوں نے بہر حال جدلیات کے شہ‌پاروں کی تخلیق کی تھی۔ ہمارے لئے محض دیدرو کے «Le Neveu de Rameau» (”راسو کا بھتیجا،،) اور روسو کے «Discours sur l'origine et les fondements de l'inégalité parmi les hommes» (”انسانوں کے درمیان عدم مساوات کی ابتدا اور بنیاد،،) کو یاد کرنا کافی ہے۔ ہم یہاں مختصر طور پر انسانی فکر کے ان دونوں طریقوں کا بنیادی کردار پیش کرتے ہیں۔

جب ہم پوری فطرت یا انسانیت کی تاریخ یا خود اپنے عمل ذہنی پر غور و فکر کرتے ہیں تو شروع میں ہمیں ایک ایسی تصویر نظر آتی ہے جس میں تعلقات اور ردعمل، ترتیب اور اتصال کی ایک ایسی اتھاہ بھول‌بھلیاں ہے جہاں کوئی چیز بھی، جہاں اور جیسی تھی، وہاں اور ویسی نہیں رہتی، بلکہ ہر چیز حرکت کرتی ہے، بدلتی ہے، وجود میں آتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے۔ لہذا ہم شروع میں تصویر کو مجموعی طور پر دیکھتے ہیں اور اس کے الگ الگ حصے اس وقت کم و بیش پس‌منظر میں رہتے ہیں۔ ہم ان چیزوں کا مشاہدہ کرنے کے بجائے جو حرکت، اتصال اور ارتباط کے عمل سے گذرتی ہیں، حرکتوں، تبدیلیوں اور روابط کا مشاہدہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ بھونڈا اور ان گھڑ، سادہ اور معصوم لیکن بنیادی طور پر صحیح تصور کائنات قدیم یونانی فلسفے کا تصور ہے اور سب سے پہلے اسے هیراقلیتس نے ایک صاف اور واضح شکل میں پیش کیا تھا: ہر شے ہے بھی اور نہیں بھی ہے کیونکہ ہر شے رواں دواں ہے، مسلسل تغیرپذیر ہے اور مسلسل وجود میں آتی اور فنا ہوتی رہتی ہے۔

لیکن یہ تصور گو مظاہر قدرت کی تصویر کے عمومی کردار کو مجموعی طور پر صحیح طریقے سے پیش کرتا ہے تاہم یہ ان

تفصیلات کی تشریح کرنے کے لئے ناکافی ہے جن پر یہ تصویر مشتمل ہے۔ اور جب تک ہم ان تفصیلات کو نہیں سمجھتے اس وقت تک ہم پوری تصویر کے متعلق کوئی صاف اور صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان تفصیلات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم انہیں ان کے فطری یا تاریخی روابط سے علیحدہ کریں اور ان میں سے ہر ایک کا، اس کی ماہیت اور خواص، مخصوص اسباب اور نتائج وغیرہ کا، الگ الگ معائنہ کریں۔ یہ بنیادی طور پر علم‌طبیعی اور تاریخی تحقیق کا کام ہے، اور یہ سائنس کی وہ شاخیں ہیں جنھیں کلاسیکی دور کے یونانیوں نے، بہت معقول وجوہ کی بنا پر، ایک ثانوی مرتبہ دے رکھا تھا، کیونکہ انہیں سب سے پہلے وہ مواد جمع کرنا تھا جس کی بنا پر یہ علوم کام کرسکیں۔ کسی طرح کا تنقیدی تجزیہ، مقابلہ اور جنس، صنف اور نوع کے اعتبار سے ترتیب کرنے کےلئے ضروری ہے کہ پہلے کسی قدر طبیعی اور تاریخی مواد اکٹھا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قطعی علوم طبیعی کی بنیادیں سب سے پہلے عہد سکندری (۵۵) کے یونانیوں نے استوار کی تھیں اور بعد میں قرون وسطی کے عربوں نے۔ اصلی علم طبیعی پندرھویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوا اور اس کے بعد سے وہ روزافزوں تیزی کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔ فطرت کا تجزیہ کرکے اسے الگ الگ حصوں میں بانٹنا، فطرت کے مختلف اعمال اور اشیا کی معین اور واضح اجناس میں درجہ‌بندی کرنا، نامیاتی اجسام کی تمام مختلف النوع شکلوں کی اندرونی ہیئت تشریحی کا مطالعہ کرنا — یہ تھیں وہ بنیادی شرائط جن کی بنا پر پچھلے چار سو سال کے عرصے میں ہمارے فطرت کے علم نے اس قدر زبردست ترقی کی ہے۔ لیکن اس طریقۂ کار نے ہمارے لئے ایک اور ورثہ بھی چھوڑا ہے — یعنی طبیعی اشیا اور اعمال کا علیحدہ علیحدہ اور مجموعی کلیت سے ان کے تعلق کو نظرانداز کرکے مشاہدہ کرنے کی عادت، اور ان اشیا اور اعمال کا حرکت کے بجائے سکون کی کیفیت میں، انہیں لازمی طور پر تغیرپذیر نہیں بلکہ مستقل سمجھ کر، اور ان کی حالت زندگی میں نہیں بلکہ حالت‌موت میں ان کا مشاہدہ کرنے کی عادت۔ جب بیکن اور لاک نے اشیا کو دیکھنے کے اس انداز کو علوم طبیعی سے فلسفے کی طرف منتقل کر دیا

تو اس نے اس تنگ و محدود ، مابعد الطبیعیاتی طریقۂ فکر کو جنم دیا جو پچھلی صدی کی خصوصیت تھا۔

ماہر مابعدالطبیعیات کے نزدیک اشیا اور ان کے ذہنی پرتو — خیالات — بالکل الگ تھلگ اور ایسی چیزیں ہیں جن کا ایک دوسرے سے علیحدہ کرکے اور ایک دوسرے کے بعد مطالعہ کرنا چاہئے ، ان کے خیال میں وہ تحقیق اور مطالعے کے غیر تغیرپذیر ، بےلوچ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہی حالت میں رہنے والے موضوعات ہیں۔ ماہر مابعد الطبیعیات ایک دوسرے سے کبھی ہم‌آہنگ نہ ہو سکنےوالے تضادوں کی اصطلاحات میں سوچتا ہے۔ اس کی گفتگو "ہاں‌ہاں ، نہیں نہیں" کی شکل میں ہوتی ہے ، کیونکہ "ان دو کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ سب عمل شیطانی ہے"۔ اس کے نزدیک کوئی شے یا موجود ہے یا غیرموجود ، کوئی شے بیک وقت خود اور غیرخود نہیں ہو سکتی۔ مثبت اور منفی میں ایک دوسرے کے لئے قطعی کوئی جگہ نہیں ، سبب اور نتیجہ مکمل طور پر ، بالکل بےلوچ طریقے سے ، ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

پہلی نظر میں تو ہمیں یہ طریقۂ فکر بہت بصیرت افروز معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ نام نہاد صحیح اور محکم عقل سلیم کا طریقۂ فکر ہے۔ لیکن مشکل صرف اتنی ہے کہ یہ صحیح اور محکم عقل سلیم صاحبہ ، جو اپنی چاردیواری کی گھریلو فضا میں اپنی عزت‌آبرو لئے بیٹھی رہتی ہیں ، تحقیق و تدقیق کی وسیع دنیا میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے زوردار ہنگاموں سے دوچار ہوتی ہیں۔ اور مابعدالطبیعیاتی طریقۂ فکر گو بہت سے میدانوں میں جائز اور ضروری ہے ، جن میں سے ہر ایک کی حدود اپنے اپنے موضوعات تحقیق کی ماہیت کے مطابق ہوتی ہیں ، لیکن دیر یا سویر یہ طریقۂ فکر ایک ایسی حد تک پہنچ جاتا ہے جس کے اس پار جانے پر وہ یک‌رخا ، محدود اور مجرد ہو جاتا ہے اور ناقابل حل تضادوں میں کھوکر رہ جاتا ہے۔ فرداً فرداً اشیا کے مطالعے میں وہ ان کے باہمی ربط و تعلق کو نظرانداز کر بیٹھتا ہے ، ان کے وجود پر غور و فکر کرتے ہوئے وہ اس وجود کی ابتدا اور انتہا کو بھول جاتا ہے ، ان کے سکون اور ٹھیراؤ پر غور و خوض کرنے میں وہ ان کی حرکت کو فراموش کر دیتا ہے ،

اور اس کی حالت بقول‌شاعر ایسی ہوتی ہے کہ ''قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل !''

روزمرہ کے معمولی واقعات کی حد تک تو ہم جانتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مثلاً کوئی جانور زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن زیادہ غور اور توجہ سے دیکھنے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی صورتوں میں یہ ایک نہایت پیچیدہ سوال ہے، جیسا کہ قانون‌داں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے بہت بہت عقل لڑائی کہ کسی طرح وہ معقول حد دریافت کر سکیں جس کے اس پار ماں کے رحم میں بچے کو مارنا قتل کے مرادف ہو جاتا ہے، لیکن سب بےسود۔ موت کے لمحے کا قطعی تعین کرنا بھی اسی قدر ناممکن ہے کیونکہ علم الاعضا ثابت کرتا ہے کہ موت کوئی فوری اور آنی مظہر نہیں ہے بلکہ بہت طول طویل مدت تک چلنے والا عمل ہے۔

اسی طرح ہر نامیاتی وجود ہر لمحے وہ چیز بھی ہے جس کا اس پر اطلاق ہوتا ہے اور اس سے مختلف بھی ہے۔ ہر لمحے وہ باہر سے مہیا کئے جانے والا مادہ جذب کرتا رہتا ہے اور کچھ اور مادہ خارج کرتا رہتا ہے، ہر لمحے اس کے جسم کے کچھ خلیے مرتے رہتے ہیں اور کچھ نئے خلیے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ کم یا کچھ زیادہ مدت میں اس کے جسم کے مادے کی مکمل تجدید ہو جاتی ہے، اور مادے کے دوسرے سالمے اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ سو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر نامیاتی وجود ہمیشہ خود بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس میں غیرخود کا کچھ عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔

علاوہ بریں زیادہ بغور مطالعے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک تضاد کے دو سرے، مثلاً مثبت اور منفی، جس قدر ایک دوسرے کے متضاد ہیں اسی قدر ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بھی ہیں، اور مزید، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اپنے تمام‌تر تضاد کے باوجود وہ ایک دوسرے میں جاری و ساریٰ بھی ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سبب اور نتیجہ ایسے تصورات ہیں جن کا اطلاق محض انفرادی شکلوں پر ہوتا ہے، لیکن جوں ہی ہم انفرادی شکلوں کو ان کے اور کل کائنات کے عمومی ربط و تعلق کے پیش‌نظر

دیکھنے لگتے ھیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ھو جاتی ھیں ، اور اسی طرح وہ اس وقت بھی آپس میں خلط‌ملط ھو جاتی ھیں جب ھم اس عالمگیر عمل اور ردعمل پر غور کرتے ھیں جس میں اسباب اور نتائج ازلی اور ابدی طور پر آپس میں اس طرح جگہ بدلتے رھتے ھیں کہ جو اس وقت اور اس جگہ نتیجہ ھے وہ دوسرے وقت اور دوسری جگہ سبب ھوگا اور اس کے برعکس سبب نتیجہ ھوگا۔

ان میں سے کسی عمل اور طریقۂ فکر کی مابعدالطبیعیاتی استدلال کے چوکھٹے میں سمائی نہیں ھے۔ اس کے برخلاف جدلیات اشیا اور ان کے پرتو اور مظاھر — خیالات — کا ادراک ان کے بنیادی ربط‌و تعلق ، سلسلہ‌بندی ، حرکت ، اصل ، آغاز اور انتہا کو نظر میں رکھتے ھوئے کرتی ھے۔ لہذا مذکورۂ‌بالا طریقہ‌ھائے عمل خود جدلیات کے طریقۂ کار ھی کی مزید تصدیق و تائید ھیں۔

خود فطرت جدلیات کی کسوٹی ھے اور جدید سائنس کے حق میں اتنا تو کہنا ھی پڑےگا کہ اس نے اس ثبوت کو روزافزوں ، بھرپور اور فراواں مواد عطا کیا ھے اور اس طرح اس نے دکھا دیا ھے کہ فطرت کا طریقۂ عمل بنیادی طور پر مابعدالطبیعیاتی نہیں ھے بلکہ جدلیاتی ھے ، اور یہ بھی دکھا دیا ھے کہ فطرت ایک ازلی اور ابدی طور پر یکساں اور لامتناھی دائرۂ تواتر میں نہیں گھومتی رھتی بلکہ وہ ایک واقعی تاریخی ارتقا سے گزرتی ھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ڈارون کا نام آنا چاھئے۔ اس نے یہ چیز ثابت کرکے کہ تمام نامیاتی وجود — نباتات ، حیوانات اور خود انسان — ایک ارتقائی عمل کی پیداوار ھیں جس کا سلسلہ کروڑوں برس سے چل رھا ھے ، مابعدالطبیعیاتی تصور فطرت پر کاری ضرب لگائی ھے۔ لیکن ایسے ماھرین علم فطرت جنھوں نے جدلیاتی ڈھنگ سے غور و فکر کرنا سیکھ لیا ھے انگلیوں پر گنے جا سکتے ھیں۔ اور اس کشمکش کو دیکھ کر ، جو نئی دریافتوں کے نتائج اور مدتوں سے مانے ھوئے طریقہ‌ھائے فکر کے درمیان پائی جاتی ھے ، اس افراتفری کا راز سمجھ میں آجاتا ھے جس کا موجودہ زمانے میں نظری علوم طبیعی میں دوردورہ ھے اور جو استاد اور شاگرد ، مصنف اور قاری سبھی کے لئے یکساں دردِ سر ھے۔

یہی وجہ ھے کہ کائنات اور اس کے ارتقا ، انسانیت کی ترقی اور

نشو و نما ، اور ذهن انسانی میں اس ارتقا کے عکس کی صحیح صحیح تصویر صرف جدلیات هی کے طریقوں سے حاصل کی جا سکتی هے کیونکه جدلیات زندگی اور موت کے اور ترقی‌پذیر یا تنزل‌پذیر تبدیلیوں کے بےشمار عمل اور ردعمل کی طرف همیشه خاص دهیان دیتی هے۔ نئے جرمن فلسفے نے اسی اسپرٹ میں کام کیا هے۔ نیوٹن کے مستحکم نظام شمسی اور اس نظام شمسی کے مشهور و معروف اولین تحریک پانے کے بعد ابد تک قائم رهنے کے نظرئے کو کانٹ نے ایک تاریخی عمل کے نتیجے — یعنی مادے کے گردش کرتے هوئے بےشکل، دهندلے ڈهیر سے سورج اور دوسرے تمام سیاروں کی تشکیل — کی حیثیت سے پیش کرکے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ اس سے به یک‌وقت اس نے یه نتیجه بهی نکالا که اگر نظام شمسی کا آغاز یه هو تو مستقبل میں اس کی موت لابدی هے۔ نصف صدی بعد لپلاس نے اس کے نظرئے کو ریاضی کے ذریعے ثابت کر دیا اور اس کے نصف صدی بعد طیف‌پیما (Spectroscope) نے اس کا مزید ثبوت دیا که فضائے‌بسیط میں گیس کے اس قسم کے روشن اور گرم هیولے‌موجود هیں جو انجماد کی مختلف منزلوں میں هیں۔

اس نئے جرمن فلسفے کی معراج هیگل کا نظام تها۔ اس نظام میں پهلی دفعه تمام دنیا — طبیعی، تاریخی اور عقلی دنیا — ایک حالت‌عمل کی شکل میں پیش کی گئی هے، یعنی مسلسل حرکت، تبدیلیٔ شکل، تغیر اور ارتقا کی حالت میں۔ اور اس اندرونی ربط کا پته چلانے کی کوشش کی گئی هے جو اس تمام حرکت اور ارتقا کو ایک مسلسل کل بناتا هے۔ اس نقطۂ نظر سے انسانیت کی تاریخ اب پهلے کی طرح تشدد کی داستان اور بےمعنی افعال کا ایک بےقابو بهنور نهیں معلوم هوتی، جو سب پخته کار فلسفیانه تعقل کی کرسیٔ عدالت کے نزدیک یکساں طور پر قابل ملامت هیں، اور جن کو جلد از جلد بهول جانا هی بهتر هے۔ اس کے بجائے اب انسانیت کی تاریخ خود انسان کے ارتقائی عمل کی شکل میں نظر آتی هے۔ اب یه عقل کا کام تها که اس بتدریج عمل کو اس کی تمام پیچ درپیچ راهوں سے گذر کر آگے بڑهتے هوئے دیکهے اور سمجهے اور اس کے تمام بظاهر حادثاتی مظاهر میں جاری و ساری اندرونی قانون کا پته چلائے۔

یہ بات کہ ہیگلی نظام نے جس مسئلے کو پیش کیا تھا اسے حل نہیں کیا یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس نظام کی عہدآفریں خدمت یہ تھی کہ اس نے مسئلے کو پیش کیا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے کوئی بھی فرد کبھی تنہا حل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہیگل — سین سائموں کی طرح — اپنے دور کے سب سے زیادہ ہمہ‌داں ذہن کا مالک تھا لیکن وہ بھی ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا تھا — اول تو اپنے لازمی طور پر محدود علم کے باعث اور دوسرے اپنے عہد کے علم اور تصورات کے محدود ہونے کے سبب سے۔ اور ان میں ایک تیسری بندش کا اضافہ بھی کرنا چاہئے۔ ہیگل عینیت‌پرست تھا۔ اس کے نزدیک اس کے ذہن میں جو خیالات تھے وہ حقیقی اشیا اور اعمال کے کم‌وبیش مجرد پرتو نہیں تھے بلکہ اس کے برخلاف اشیا اور ان کا ارتقا صرف اس ”عین،، (خیال) کی تشکیل و تکمیل ہے جو دنیا کے وجود سے پہلے ہی ازل سے اسی طرح کہیں موجود ہے۔ اس طریقۂ فکر نے ہر چیز کو الٹ‌پلٹ کر رکھ دیا اور دنیا میں اشیا کا جو واقعی رابطہ اور رشتہ ہے اسے بالکل سر کے بل کھڑا کر دیا۔ گو ہیگل نے کئی مجموعۂ حقائق کو فرداً فرداً بہت طباعی سے اور صحیح طور پر سمجھ لیا تھا لیکن انہیں وجوہ کی بنا پر جو ابھی بیان کئے گئے ہیں، اس کے یہاں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن میں تصنع اور آورد پائی جاتی ہے اور جو پیوند کے مانند معلوم ہوتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ غلط ہیں۔ ہیگلی نظام بجائے خود ایک بہت بڑی ناکامی تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ اپنی قسم کی آخری چیز بھی تھا۔ دراصل وہ ایک اندرونی اور ناقابل علاج تضاد کا شکار تھا۔ ایک طرف تو اس کا بنیادی دعوی یہ تصور تھا کہ انسانی تاریخ ایک مسلسل عمل ارتقا ہے، جس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ اس کو کسی قسم کی نام‌نہاد صداقت مطلق کی دریافت میں اپنی آخری عقلی تکمیل نہیں مل سکتی۔ لیکن دوسری طرف اس نظام نے اسی صداقت مطلق کے جوہر خاص ہونے کا دعوی بھی کیا۔ فطری اور تاریخی علم کا ایک ایسا نظام جو تمام چیزوں اور تمام زمانوں پر حاوی اور ہمہ گیر ہو جدلیاتی استدلال کے بنیادی قانون کے منافی ہے۔ اور یہ قانون اس خیال سے قطعی منکر نہیں ہے

کہ خارجی کائنات کا ایک منظم اور مرتب علم، ہر پہلے دور کے مقابلے میں اس سے اگلے دور میں، زبردست ترقی کر سکتا ہے۔ اس کے برخلاف جدلیاتی استدلال کے بنیادی قانون نے اس خیال کو اپنے یہاں شامل کیا ہے۔

جرمن عینیت‌پرستی میں بنیادی تضاد کی موجودگی کا شعورواحساس لازمی طور پر مادیت کی طرف واپس لے گیا، لیکن خیال رہے کہ اٹھارھویں صدی کی محض مابعدالطبیعی اور مکمل طور پر میکانکی مادیت کی طرف نہیں لے گیا۔ پرانی مادیت تمام پرانی تاریخ کو نامعقولیت اور تشدد کا ایک بےشکل تودہ سمجھتی تھی، اور جدید مادیت تاریخ کو انسانیت کے ارتقا کا عمل مسلسل سمجھتی ہے اور اس کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اٹھارھویں صدی کی فرانسیسی مادیت کے یہاں، اور صرف اسی کے نہیں بلکہ ہیگل کے یہاں بھی، مجموعی طور پر فطرت کا جو تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ فطرت تنگ‌دائروں میں حرکت کرتی‌رہتی ہے اور دائمی طور پر غیرمتغیر ہے، اور اس کے یہاں نیوٹن کی تعلیمات کے مطابق ابدی اجرام فلکی، اور لینیئی کی تعلیمات کےمطابق ناقابل تبدیلی نامیاتی انواع ہیں۔ جدید مادیت علم طبیعی کی جدید دریافتوں کو بھی اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی ہے۔ ان دریافتوں کے مطابق فطرت کی بھی وقت کی حدود میں ایک تاریخ ہے، اور اجرام فلکی، ان نامیاتی اجسام کی طرح جو مناسب حالات ہونے پر ان میں آباد ہوتے ہیں، خود بھی موجود اور معدوم ہوتے رہتے ہیں۔ اگر فطرت کےلئے مجموعی طور پر اب بھی یہ کہا جائے کہ وہ سلسلۂ‌تواتر (یا باربار واقع ہونےوالے چکروں) میں گھومتی رہتی ہے تب بھی یہ مکرر چکر یا سلسلے بےحد بڑی اور وسیع و عریض شکل تو ضرور ہی اختیار کر لیتے ہیں۔ دونوں لحاظ سے جدید مادیت بنیادی طور پر جدلیاتی ہے، اور اسے اب اس قسم کے فلسفے کی مدد کی احتیاج نہیں ہے جو پہلے ایک راجہ کی سی تمکنت کےساتھ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ سائنس کی باقی تمام پرجا پر راج کرتا ہے۔ جوں ہی اشیا کی اور اشیا کےمتعلق ہمارے علم کی عظیم جامعیت میں ہر مخصوص علم لازماً اپنے مقام کی وضاحت اور تعین کردےگا، ویسے ہی وہ خاص علم جس کا موضوع یہ جامعیت

ہو بےکار اور غیرضروری ہوجائےگا۔ پورے پچھلے فلسفے میں سے لے دے کر اگر کچھ باقی رہ گیا ہے تو فکر و خیال کا علم اور اس کے قوانین — اصول منطق (formal logic) اور جدلیات۔ اور باقی سب کچھ تاریخ اور فطرت کے علم‌ثبوتی میں ضم ہو کر رہ گیا۔

لیکن ، اگرچہ تصور فطرت میں انقلاب اسی تناسب سے ہو سکتا تھا جس تناسب سے تحقیق نے اس سلسلے کا مثبت مواد مہیا کیا تھا ، مگر بہت عرصہ پہلے ہی بعض ایسے تاریخی وقائع رونما ہوئے تھے جنھوں نے تصور تاریخ میں فیصلہ کن تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ۱۸۳۱ ء میں لیون میں مزدور طبقے کی پہلی بغاوت نے جنم لیا۔ ۱۸۳۸ء اور ۱۸۴۲ ء میں مزدور طبقے کی پہلی قومی تحریک — انگریزی چارٹسٹ تحریک — اپنے نقطۂ عروج تک پہنچی۔ یورپ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کی تاریخ میں بورژوا طبقے اور پرولتاریوں کی باہمی طبقاتی کشمکش اسی تناسب سے سامنے آئی جس تناسب سے ایک طرف تو جدید صنعت کا ارتقا ہوا اور دوسری طرف بورژوا طبقے کا نیا نیا حاصل کیا ہوا سیاسی اقتدار بڑھا۔ حقائق روز بروز زیادہ زورشور سے بورژوا ماہرین معاشیات کی ان تعلیمات کی تردید کرنے لگے کہ سرمایہ و محنت کا مفاد ایک ہے اور بے لگام مقابلے کے نتیجے کے طور پر ہمہ‌گیر ہم‌آہنگی اور ہمہ‌گیر خوشحالی کا دوردورہ ہوگا۔ اب زیادہ دن تک ان سب چیزوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور اسی طرح فرانسیسی اور انگریزی سوشلزم کو بھی ، جو ان کا نظری ، گو بہت ناقص ، اظہار تھا ، نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ لیکن پرانا عینیت‌پرست تصور تاریخ جو ابھی تک پوری طرح تخت سے نہیں اترا تھا ، معاشی مفاد پر مبنی طبقاتی کشمکش سے ناواقف محض تھا ، وہ معاشی مفاد سے بھی بالکل ناواقف تھا۔ اس تصور تاریخ میں پیداوار اور تمام معاشی تعلقات " تہذیب کی تاریخ " میں محض حادثاتی اور کم‌تر درجے کے عناصر کی حیثیت سے نظر آتے تھے۔

نئے حقائق نے اس چیز کو نہایت اہم اور ضروری بنا دیا کہ تمام گذشتہ تاریخ کا نئے سرے سے مطالعہ اور معائنہ کیا جائے۔ اور تب معلوم ہوا کہ بالکل ابتدائی عہد کے علاوہ تمام گذشتہ تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے ، اور سماج کے یہ مصروف پیکار طبقے

همیشه پیداوار اور تبادلے کے طریقوں کے — یا مختصر یه که اپنے زمانے کے معاشی حالات کے — پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح یه بھی دیکھا گیا که همیشه سماج کا معاشی ڈھانچه اصلی بنیاد سہیا کرتا ہے اور صرف اسی بنیاد سے شروع کر کے ہم کسی ایک تاریخی دور کے تمام قانونی اور سیاسی اداروں کی اور اسی طرح اس کے مذہبی، فلسفیانه اور دوسرے خیالات کی تمام عمارت کی آخری توجیہه اور تشریح کر سکتے ہیں۔ ہیگل نے تاریخ کو مابعدالطبیعیات سے نجات دلائی تھی۔ اس نے تاریخ کو جدلیاتی بنا دیا تھا لیکن اس کا تصورتاریخ بنیادی طور پر عینی تصور تھا۔ اور اب عینیت‌برستی کو اس کی آخری جائے پناہ — فلسفۂ تاریخ — سے بھی نکالا مل گیا تھا۔ اب تاریخ کا مطالعه کرنے کا ایک مادیت‌پسندانه طریقۂ کار پیش کیا گیا، اور آدمی کے "وجود" کی توجیہه اس کے "شعور" کے ذریعے کرنے کے بجائے، جیسا که اب تک ہوتا چلا آیا تھا، اس کے "شعور" کی توجیہه اس کے "وجود" کے ذریعے کرنے کا طریقه دریافت کر لیا گیا۔

اس وقت سے سوشلزم کسی ایک یا دوسرے تیز اور طباع دماغ کی اتفاقی اور حادثاتی دریافت نہیں رہا، اب تو وہ دو تاریخی طور پر ارتقایافته طبقوں — پرولتاریه اور بورژوا — کی باہمی کشمکش کا لازمی ماحصل بن گیا تھا۔ اب اس کا کام یه نہیں تھا که کسی طرح ایک زیادہ سے زیادہ مکمل اور بے عیب نظام معاشرہ کی تخلیق کرے، اب اس کا کام ہوگیا تھا ان تاریخی اور معاشی سلسلۂ واقعات کا مطالعه اور معائنه کرنا جنھوں نے لازمی طور پر ان طبقات اور ان کی تناتنی کو جنم دیا تھا، اور اس طرح پیداشدہ معاشی حالات میں اس آویزش کو دور کرنے کے ذرائع ڈھونڈھ نکالنا۔ لیکن پرانے زمانے کا سوشلزم اس مادیت‌پسندانه تصور سے اسی قدر مختلف اور بے آہنگ تھا جتنا فرانسیسی مادیت‌پسندوں کا تصور فطرت جدلیات اور جدید علوم طبیعی سے۔ یه صحیح ہے که پرانے زمانے کا سوشلزم مروجه سرمایه‌داری طریق پیداوار اور اس کے نتائج کی تنقید کرتا تھا لیکن یه سوشلزم ان چیزوں کی توجیہه نہیں کر سکتا تھا، اور اسی لئے ان پر غلبه بھی نہیں پا سکتا تھا۔ وہ تو صرف ان کو برا کہه کر

مسترد ہی کر سکتا تھا۔ یہ پرانا سوشلزم جتنے زورشور اور شد و مد سے مزدور طبقے کے استحصال کی، جو سرمایہ‌داری کے تحت ایک ناگزیر چیز ہے، مذمت کرتا تھا، اتنا ہی وہ صاف طور پر یہ نہیں دکھا سکتا تھا کہ یہ استحصال کن باتوں پر مشتمل ہے اور کس طرح اس کا آغاز ہوا۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ (۱) سرمایہ‌داری طریقۂ پیداوار کو اس کے تاریخی ربط و تعلق کے ساتھ اور ایک خاص تاریخی دور میں اس کے ناگزیر ہونے کی حیثیت سے پیش کیا جائے، اور اسی لئے اس کے ناگزیر زوال کو بھی واضح کیا جائے اور (۲) اس کے بنیادی کردار کو، جو اب تک پردۂ راز تھا، فاش کیا جائے۔ یہ کام قدرزائد کی دریافت کے ذریعے ہوا۔ یہ دکھایا گیا کہ اس محنت کو، جس کی اجرت ادا نہیں کی گئی ہے، اپنے تصرف میں لانا سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور مزدور کے اس طریق پیداوار کے تحت ہونے والے استحصال کی بنیاد ہے۔ یہ بھی دکھایا گیا کہ اگر سرمایہ‌دار اپنے مزدور کی قوت محنت کو منڈی میں تجارتی مال کی طرح اس کی پوری قدر پر خریدے، تب بھی اسے اس سے زیادہ قدر حاصل ہوتی ہے جتنی کے اس نے پیسے ادا کئے ہیں، اور آخری تجزیے میں اسی قدر زائد سے قدر کی وہ رقمیں بنتی ہیں جن سے صاحب‌جائداد طبقوں کے پاس سرمائے کے روزافزوں انبار لگتے رہتے ہیں۔ اس طرح سرمایہ‌داری پیداوار کی ابتدا اور سرمائے کی پیداوار دونوں کی تشریح و توضیح ہوگئی۔

تاریخ کا مادیت پسندانہ تصور اور سرمایہ‌داری طریق پیداوار کے راز کا قدر زائد کے ذریعے فاش ہونا — ان دو عظیم دریافتوں کے لئے ہم مارکس کے مرہون منت ہیں۔ ان دریافتوں کے بعد سوشلزم ایک علم بن گیا۔ اب سوشلزم کی تمام تفصیلات اور تعلقات کی ترتیب و تشکیل اگلا قدم تھا۔

۳

تاریخ کا مادیت پسندانہ تصور اس نظریہ کو لے کر آگے بڑھتا ہے کہ انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے ذرائع کی پیداوار اور پیدا

کی هوئی اشیا کا تبادله، تمام سماجی ڈھانچے کی بنیاد ہے، اور هر اس سماج میں جو تاریخ میں نمودار هو چکا ہے دولت کی تقسیم اور سماج کے طبقوں یا مدارج میں بٹنے کے انداز اور ڈھنگ کا دار و مدار اس چیز پر ہے که اس میں کیا چیزیں پیدا کی جاتی هیں، کس طرح پیدا کی جاتی هیں اور پیداوار کے تبادلے کا کیا طریقه ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق تمام سماجی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کے اصلی سبب و علت کو انسانوں کے دماغوں میں، اور ابدی صداقت اور عدل کے بارے میں انسان کی بڑھتی هوئی بصیرت میں نہیں تلاش کرنا چاهئے، بلکه طریق پیداوار اور طریق تبادله میں هونے والی تبدیلیوں میں ان اسباب کو ڈھونڈنا چاهئے۔ ان کو هر دور کے فلسفے میں نہیں بلکه اس کی معاشیات میں تلاش کرنا چاهئے۔ اس چیز کا بڑھتا هوا شعور و ادراک که موجوده سماجی ادارے غیرعقلی اور غیرمنصفانه هیں، اور ”معقولیت نامعقولیت اور حق باطل بن چکا ہے“* بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے که طریق پیداوار اور طریق تبادله میں چپکے هی چپکے ایسی تبدیلیاں پیدا هو گئی هیں جن کے ساتھ سماجی نظام، جو اب سے پہلے کے معاشی حالات کے لئے موزوں تھا، اب همآهنگ نہیں رها ہے۔ اور اسی سے یه نتیجه بھی نکلتا ہے که جن بےآهنگیوں اور ناسوزونیوں کو بےنقاب کیا گیا ہے ان سے نجات پانے کے ذرائع بھی ضرور کم و بیش ارتقایافته شکل میں خود بدلے هوئے طریق پیداوار هی میں مضمر هوں گے۔ بنیادی اصولوں سے استخراج کے ذریعے یه ذرائع ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں بلکه ان کو پیداوار کے موجوده نظام کے سخت و سرکش حقائق میں دریافت کرنا هوگا۔

آئیے دیکھیں اس سلسلے میں جدید سوشلزم کی کیا حیثیت ہے؟

اب یه چیز عام طور پر مان لی گئی ہے که سماج کا موجوده ڈھانچه آج کے حکمراں طبقے، یعنی بورژوا طبقے کا پیدا کیا هوا ہے۔ بورژوا طبقے کا مخصوص طریق پیداوار، جو مارکس کے وقت سے سرمایهداری طریق پیداوار کہلانے لگا ہے، نظام جاگیرداری کے ساتھ همآهنگ

* گوئٹے کے ”فاؤسٹ“ میں میفسٹوفیلیس کے الفاظ۔ (ایڈیٹر)

نہیں تھا۔ اس نظام نے افراد کو ، پورے پورے سماجی مدارج کو اور مقامی کارپوریشنوں کو مخصوص مراعات دے رکھی تھیں اور اسی کے ساتھ اس کی سماجی تنظیم کا پورا ڈھانچہ خدمت اور تابعداری کے موروثی بندھنوں پر مشتمل تھا۔ بورژوا طبقے نے جاگیرداری نظام کو توڑ ڈالا اور اس کے کھنڈروں پر سماج کے سرمایہ‌داری نظام کی ــ مقابلۂ آزاد ، شخصی آزادی ، قانون کی نظروں میں جنس تبادلہ کے سارے مالکوں کی مساوات ، اور باقی تمام سرمایہ‌داری برکتوں کی ــ سلطنت تعمیر کی۔ اس وقت سے سرمایہ‌داری طریق پیداوار آزادی سے ترقی کر سکا۔ جب سے بھاپ ، مشینری اور مشینری سے مشین بنانے کے طریقے نے پرانے کارخانہ‌داری نظام کو جدید صنعت میں تبدیل کر دیا ، بورژوا طبقے کی رہبری میں ابھرنے اور پنپنے والی پیداواری قوتوں نے اس قدر تیزی سے اور اس حد تک ترقی کی ہے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آئی تھی۔ لیکن جس طرح اپنے وقت میں پرانے کارخانہ‌داری نظام اور دستکاری کی ، جو اس کے اثر سے زیادہ ترقی‌یافتہ ہو گئی تھی ، '' گلڈ ،، کی جاگیرداری بندشوں اور زنجیروں سے ٹکر ہوئی تھی بالکل اسی طرح اپنے زیادہ مکمل ارتقا کے دوران میں جدید صنعت کا ان قیود اور پابندیوں سے تصادم ہو رہا ہے جن میں سرمایہ‌داری طریق پیداوار نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ نئی پیداواری قوتیں ابھی سے ان قوتوں کو استعمال کرنے کے سرمایہ‌داری طریقے سے آگے نکل گئی ہیں۔ اور پیداواری قوتوں اور طریق پیداوار کی یہ باہمی کشمکش و آویزش آدم کے '' گناہ اولین ،، اور '' عدل خداوندی ،، کی باہمی آویزش کی طرح انسانی دماغ کی پیداوار نہیں ہے۔ دراصل یہ تو واقعی اور خارجی طور پر ، ہمارے باہر ، ان انسانوں کے ارادے اور اعمال سے بھی آزاد اور خودمختار جو اس کو بروئےکار لائے ہیں ، موجود ہے۔ جدید سوشلزم دراصل صرف حقیقت میں موجود اس کشمکش و آویزش کا خیالی مظہر اور پرچھائیں ہے ، سب سے بڑھ کر یہ کشمکش کا براہ‌راست شکار ہونے والے طبقے ، یعنی مزدور طبقے کے ذہنوں میں اس حقیقت کا خیالی پرتو ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کشمکش اور آویزش کن چیزوں پر مشتمل ہے ؟

سرمایہ‌داری پیداوار سے پہلے، یعنی قرون وسطی میں، عام طور پر چھوٹی صنعت کا نظام رائج تھا جس کی بنیاد اس چیز پر تھی کہ مزدوروں کے ذرائع پیداوار ان کی ذاتی ملکیت ہوں۔ دیہات میں چھوٹے کسان، آزاد مزارع یا زرعی غلام کی کاشت‌کاری اور شہروں میں گلڈ کے ذریعے منظم کی ہوئی دستکاری کا رواج تھا۔ آلات محنت — زمین، زرعی اوزار، ورک شاپ اور آلات وغیرہ فرد واحد کی محنت کے آلات تھے اور ایک ہی مزدور کی محنت کے لئے موزوں اور مناسب تھے اور اسی لئے لازمی طور پر چھوٹے، ہلکے پھلکے، کم‌حیثیت اور محدود تھے۔ لیکن ٹھیک اسی وجہ سے وہ عموماً خود پیدا کرنے والے کی ملکیت ہوتے تھے۔ ان بکھرے ہوئے اور محدود ذرائع پیداوار کو مرکوز و متحد کرنا، انھیں توسیع دینا اور انھیں موجودہ زمانے کی پیداوار کی توسیع کے طاقت‌ور وسیلے کی شکل دینا — ٹھیک یہ تاریخی رول تھا سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور اس کے علم‌بردار، یعنی بورژوا طبقے کا۔ مارکس نے ''سرمایہ'' کے چوتھے حصے میں تفصیل سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ پندرھویں صدی سے لے کر اب تک کس طرح یہ کام تاریخی طور پر تین مختلف منازل — سادہ امداد باہمی، کارخانہ‌داری اور جدید صنعت سے گزر کر انجام دیا گیا ہے۔ لیکن بورژوا طبقہ، جیسا کہ ''سرمایہ'' میں دکھایا گیا ہے، اس وقت تک ان چھوٹے اور ادنی ذرائع پیداوار کو عظیم پیداواری قوتوں میں تبدیل نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ ساتھ ہی ساتھ انھیں فرد کے ذرائع پیداوار سے سماجی ذرائع پیداوار میں تبدیل نہ کر دے جن کو صرف بہت سے انسان مل کر ہی استعمال کر سکتے تھے۔ کرگھے اور چرخے اور لوہار کی ہتوڑی کی جگہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی مشین اور بھاپ کی طاقت سے چلنے والے ہتوڑے نے لے لی، انفرادی ورک شاپ کی جگہ فیکٹری نے لے لی جس میں سینکڑوں اور ہزاروں مزدوروں کا کام کرنا ضروری تھا۔ اسی طرح خود عمل پیداوار نے بھی انفرادی سلسلۂ اعمال کے بجائے سماجی سلسلۂ اعمال کی شکل اختیار کر لی اور مصنوعات انفرادی کے بجائے سماجی ہو گئیں۔ اب دھاگا، کپڑا اور دھات کی بنی ہوئی اشیا جو فیکٹری سے نکل کر آتی تھیں بہت سے مزدوروں کی مشترکہ محنت کی پیداوار

بن گئیں جن کے هاتھوں سے انھیں یکے بعد دیگرے تیار ہونے سے پہلے گذرنا پڑتا تھا۔ اب کوئی ایک شخص ان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا تھا ''اسے میں نے بنایا، یہ میری پیدا کی ہوئی چیز ھے''۔

لیکن جس کسی سماج میں بھی پیداوار کی بنیادی شکل وہ بےساختہ اور فطری قسم کی تقسیم محنت ہو جو کسی سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ رفتہ‌رفتہ دبے پاؤں گھس آتی ھے، وہاں پیداشدہ اشیا جنس تبادلہ کی شکل اختیار کر لیتی ھیں جن کا باھمی تبادلہ اور خرید و فروخت اشیا پیدا کرنےوالے افراد کے لئے یہ امکان پیدا کرتی ھے کہ وہ اپنی بہت سی مختلف ضروریات پوری کر سکیں۔ اور قرون وسطی میں یہی صورت تھی۔ مثلاً کسان دستکار کے ھاتھ اپنی زرعی پیداوار بیچ دیتا تھا اور اس سے دستکاری کی اشیا خرید لیتا تھا۔ انفرادی طور پر مال پیدا کرنے والے، یعنی جنس تبادلہ پیدا کرنے والے افراد کے اس سماج میں نیا طریق پیداوار درانہ گھس آیا۔ اس پرانی تقسیم محنت کے درمیان، جو فطری اور بےساختہ طور پر، کسی واضح اور معین منصوبے کے بغیر پیدا ہو گئی تھی، اور جو پورے کے پورے سماج پر حاوی تھی، اب ایک اور تقسیم محنت پیدا ہو گئی جو ایک واضح اور معین منصوبے کے مطابق تھی — مثلاً فیکٹری کی تنظیم۔ انفرادی پیداوار کے پہلو بہ پہلو سماجی پیداوار بھی نظر آنے لگی۔ دونوں کی مصنوعات ایک ھی منڈی میں بکتی تھیں اور اسی لئے کم و بیش مساوی قیمتوں پر بکتی تھیں۔ لیکن ایک واضح اور معین منصوبے پر مبنی تنظیم فطری اور بےساختہ تقسیم محنت سے زیادہ طاقت‌ور تھی۔ کارخانے جو بہت سے افراد کی مجتمع اور مشترکہ سماجی قوتوں کا استعمال کرتے تھے، اپنی مصنوعات اس سے کہیں زیادہ سستے طریقے پر پیدا کر سکتے تھے جتنا کہ چھوٹے، انفرادی طور پر اشیا پیدا کرنے والوں کے لئے ممکن تھا۔ انفرادی طریق پیداوار یکے بعد دیگرے مختلف شعبوں میں ھتھیار ڈالتا ھی چلا گیا۔ پیداوار کے سماجی ڈھنگ نے پیداوار کے تمام پرانے طریقوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن ساتھ ھی اس کے انقلابی کردار کو اتنا کم سمجھا اور مانا گیا کہ وہ بجائے انقلابی حیثیت سے پیش کئے جانے کے جنس تبادلہ کی پیداوار کو

توسیع و ترقی دینے کے ذریعے کی حیثیت سے استعمال کیا گیا۔ جس وقت یہ سماجی ڈھنگ کی پیداوار ابھری تو اس نے جنس تبادلہ کی پیداوار اور تبادلے کے لئے چند بنی بنائی تیارشدہ چیزوں — مثلاً تاجروں کا سرمایہ، دستکاری، اجرتی محنت — کو موجود پایا اور اس نے ان سے خوب فائدہ بھی اٹھایا۔ چونکہ سماجی ڈھنگ کی پیداوار نے اپنے آپ کو جنس تبادلہ کی پیداوار کی ایک نئی شکل کی حیثیت سے پیش کیا تھا اس لئے یہ بات قرین قیاس تھی کہ اس کے زیرسایہ تصرف اور ملکیت کی تمام پرانی شکلیں زورشور سے قائم رهیں اور ان کا اطلاق اس طریق پیداوار کے تحت بننے والی مصنوعات پر بھی ہوتا رہا۔

جنس تبادلہ کی پیداوار کے ارتقا کے اس دور میں جس کا تعلق قرون وسطی سے ہے، محنت کی پیداوار کے مالک کے متعلق کوئی سوال ہی نہیں اٹھ سکتا تھا۔ انفرادی طور پر اشیا پیدا کرنے والا عموماً اس خام مواد سے جو اسی کی ملکیت ہوتا تھا اور عام طور پر اسی کا بنایا ہوا ہوتا تھا، اشیا کو خود اپنے اوزاروں سے اور اپنے یا اپنے خاندان کے دست و بازو کی محنت سے تیار کرتا تھا۔ اسے اس نئی پیداشدہ شے پر تصرف اور قبضہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو معمولاً اور بہر صورت بلاشرکت غیرے اس کی ملکیت ہوتی ہی تھی۔ لہذا خود اس کی اپنی محنت اس کے پیداوار کا مالک ہونے کی بنیاد تھی۔ اور جہاں کہیں خارجی مدد کا استعمال کیا بھی جاتا تھا تو عام طور پر اس کی اہمیت محض ضمنی اور جزوی ہوتی تھی اور عموماً اس کا بدلہ اجرت دینے کے بجائے اور کسی طرح کر دیا جاتا تھا — گلڈ کے اجرت‌یافتہ کاریگر اور شاگرد زیادہ‌تر مزدوری اور کھانے کی خاطر نہیں بلکہ تعلیم و تربیت پانے کی خاطر کام کرتے تھے، اور اس خیال سے کام کرتے تھے کہ وہ خود آئندہ استاد کاریگر کا رتبہ حاصل کر سکیں۔

اس کے بعد ذرائع پیداوار اور پیدا کرنے والے دونوں کے بڑی بڑی ورک شاپوں اور کارخانوں میں مرکوز اور مجتمع ہونے کا، ان کے واقعی سماجی ذرائع پیداوار اور سماجی ڈھنگ کے پیدا کرنے والوں میں تبدیل ہونے کا زمانہ آیا۔ لیکن سماجی ڈھنگ کے پیدا کرنے‌والوں اور ذرائع پیداوار اور ان سے حاصل‌شدہ پیداوار کو اس تبدیلی کے

بعد بھی ، پہلے ہی کی طرح ، افراد کے ذرائع پیداوار اور حاصل پیداوار سمجھا جاتا رہا۔ اب تک تو آلات محنت کا مالک خود ہی پیداوار پر قابض ہوتا تھا کیونکہ عام طور پر وہ اسی کی پیداوار ہوتی تھی اور دوسروں کی مدد ایک مستثنی چیز تھی۔ اب آلات محنت کا مالک پیداوار پر ہمیشہ اپنا قبضہ جمانے لگا حالانکہ اب یہ اس کی پیداوار نہیں ہوتی تھی بلکہ مکمل طور پر دوسروں کی محنت کی پیداوار ہوتی تھی۔ اس طرح اب جو پیداوار اجتماعی طور پر حاصل کی جاتی ہے اس پر ان لوگوں کا قبضہ نہیں ہوتا جو دراصل ذرائع پیداوار کو حرکت میں لاتے ہیں اور جنس تبادلہ پیدا کرتے ہیں بلکہ سرمایہ‌دار اس پر قابض ہوتے ہیں۔ ذرائع پیداوار اور خود پیداوار دونوں بنیادی طور پر سماجی ڈھنگ کے ہو گئے تھے لیکن وہ تصرف اور ملکیت کی ایک ایسی شکل کے تابع تھے جس کے لئے الگ الگ افراد کی نجی پیداوار ایک لازمی چیز ہے ، اور جس کے تحت ہر شخص خود اپنی پیداشدہ اشیا کا مالک ہوتا ہے اور خود ہی اسے منڈی میں لاتا ہے۔ طریق پیداوار ملکیت اور تصرف کی اس شکل کے تابع ہے باوجودیکہ وہ ان حالات کا خاتمہ کرتا ہے جن پر اس شکل کی بنیاد ہے*۔

---

* اس سلسلے میں یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ملکیت اور تصرف کی شکل وہی رہنے کے باوجود ملکیت اور تصرف کے کردار میں مندرجۂ بالا تبدیلیوں کے باعث اسی قدر انقلاب پیدا ہوا ہے جس قدر پیداوار میں ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں چیزوں میں بہت فرق ہے کہ میں اپنی پیداوار کو اپنے قبضے اور تصرف میں لاؤں یا کسی دوسرے کی پیداوار کو۔ برسبیل تذکرہ اس چیز کا بھی ذکر کرتے چلیں کہ اجرت پر کام کرنے کا طریقہ جس کے اندر تمام سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار کے بیج موجود ہیں بہت قدیم چیز ہے۔ اتفاقی ، اکادکا اور منتشر شکل میں صدیوں سے غلامانہ محنت کے ساتھ ساتھ اس کا بھی وجود رہا ہے۔ لیکن یہ بیج بڑھ کر سرمایہ‌داری طریق پیداوار اسی وقت بن سکا جب کہ اس کے لئے ضروری تاریخی حالات مہیا ہوگئے۔ (اینگلس کا نوٹ)

اس تضاد میں جو نئے طریق پیداوار کو اس کا سرمایہ‌دارانہ کردار بخشتا ہے ، آج کی تمام سماجی آویزشوں کے بیج موجود ہیں ۔ نئے طریق پیداوار نے پیداوار کے تمام اہم شعبوں اور تمام صنعتی ملکوں پر جتنا زیادہ قابو پایا ، اسی تناسب سے اس نے انفرادی پیداوار کو ایک معمولی تلچھٹ کی حیثیت دے دی ، اور اسی تناسب سے یہ بات کھلتی گئی کہ سماجی ڈھنگ کی پیداوار کا سرمایہ‌داری ملکیت اور تصرف سے جوڑ نہیں بیٹھتا ۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے ابتدائی سرمایہ‌داروں کو کام کے اور طریقوں کے ساتھ ساتھ اجرتی محنت کا طریقہ منڈی میں تیارشدہ شکل میں مل گیا تھا ۔ لیکن اجرتی محنت مستثنی ، اضافی ، زائد ، امدادی اور عارضی قسم کی تھی ۔ کاشتکار اگرچہ کبھی کبھی دن دن بھر کی مزدوری کر لیتا تھا لیکن اس کے پاس اپنی ذاتی چند ایکڑ زمین ہوتی تھی جس پر وہ بہر صورت تنگی ترشی سے تو گزارہ کر ہی سکتا تھا ۔ گلڈ کی تنظیم کچھ ایسی تھی کہ آج کا اجرت‌یافتہ کاریگر کل استاد کاریگر بن‌سکتا تھا ۔ لیکن جوں ہی ذرائع پیداوار سماجی بنے اور سرمایہ‌داروں کے ہاتھ میں مرکوز ہوئے یہ سب کچھ بدل گیا ۔ انفرادی طور پر پیدا کرنےوالے کے ذرائع پیداوار اور پیداوار دونوں چیزیں روزبروز بیکار اور بےمصرف ہوتی چلی گئیں ۔ اب اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ سرمایہ‌دار کے لئے اجرت پر کام کرے ۔ اجرتی محنت جو اب تک مستثنی اور ضمنی سی چیز تھی اب تمام پیداوار کی بنیاد اور عام اصول بن گئی ۔ اب تک وہ ایک زائد اور امدادی سی چیز تھی لیکن اب مزدور کا واحد کام بن گئی ۔ وہ جو وقتی اور عارضی طور پر اجرتی مزدور تھا اب تمام عمر کے لئے اجرتی مزدور بن گیا ۔ اس کے علاوہ ان اجرتی مزدوروں کی تعداد میں جاگیرداری نظام کے زوال کی وجہ سے ، جو اسی زمانے میں رونما ہوا ، بہت غیرمعمولی اضافہ ہوا ، کیونکہ اس زمانے میں جاگیرداری رؤسا کے وابستۂ دولت درباریوں اور مصاحبین کا شیرازہ بکھر گیا اور کسان کھیتوں سے بے دخل کر دئے گئے وغیرہ وغیرہ ۔ اب ایک طرف تو سرمایہ‌داروں کے ہاتھوں میں مرکوز

ذرائع پیداوار تھے ، اور دوسری طرف اپنی قوت محنت کے علاوہ اور هر شے سے محروم پیدا کرنےوالے ، اب ان کی باهمی دوری اور علیحدگی کی تکمیل هو گئی تھی۔ سماجی ڈهنگ کی پیداوار کا سرمایہ‌داری ملکیت اور تصرف سے باهمی تضاد کا اظهار پرولتاری اور بورژوا طبقوں کی آویزش کی شکل میں هوا۔

هم نے دیکھ لیا هے که سرمایہ‌داری طریق پیداوار جنس تبادله (مال) پیدا کرنے والوں کے ، یعنی انفرادی طور پر اشیا پیدا کرنے والوں کے سماج میں درانه گھس آیا جن کا سماجی بندهن ان کی پیداوار کا تبادله تھا۔ لیکن جنس تبادله کی پیداوار پر مبنی هر سماج میں یه خصوصیت هے که پیدا کرنے والوں کا اپنے باهمی سماجی تعلقات پر قابو باقی نهیں رهتا ۔ هر شخص کے پاس جو کچھ بھی ذرائع پیداوار موجود هوتے هیں انهیں سے اور جس قسم کے تبادلے کی اسے اپنی باقی مانده ضروریات کی آسودگی کے لئے حاجت هوتی هے اسی تبادلے کے لئے وه اپنے واسطے اشیا پیدا کرتا هے ۔ کوئی نهیں جانتا که اس کی جنس تبادله کی کتنی مقدار منڈی میں آنےوالی هے اور نه هی یه جانتا هے که اس میں سے کتنی جنس کی ضرورت هوگی۔ کوئی شخص یه نهیں جانتا که اس کی اپنی پیداوار کی واقعی مانگ هوگی یا نهیں ، وه اپنی پیداوار کا خرچه نکال سکےگا یا نهیں ، بلکه اپنی جنس تبادله کو سرے سے بیچ بھی پائےگا یا نهیں ۔ اس سماجی پیداوار میں افراتفری کا راج هے ۔

لیکن اور هر قسم کی پیداوار کی طرح جنس تبادله کی پیداوار کے بھی اپنے مخصوص اور راسخ قانون هوتے هیں جنهیں اس سے الگ نهیں کیا جا سکتا ، اور یه قوانین نراج کے باوجود اور نراج کے اندر هی مصروف‌عمل هوتے هیں ۔ وه سماجی تعلقات‌باهمی کی واحد مستقل شکل میں اپنا اظهار کرتے هیں ، یعنی‌تبادلے کی شکل میں ، اور یهاں وه انفرادی پیدا کرنےوالوں پر مقابلے کے جبری قوانین کی حیثیت سے اثرانداز هوتے هیں ۔ شروع شروع میں تو خود انفرادی پیدا کرنےوالے بھی ان قوانین سے واقف نهیں هوتے اور انهیں رفته رفته ، تجربے کے نتیجے کے طور پر یه قوانین دریافت کرنا هوتے هیں ۔ اسی‌لئے یه قوانین پیدا کرنےوالوں کی مرضی اور ارادے سے آزاد اور ان کے

برخلاف اپنا کام کرتے ھیں ، اور مخصوص طریق پیداوار کے اٹل فطری قوانین کی حیثیت سے مصروف کار ھوتے ھیں۔ پیداوار ، پیدا کرنےوالوں پر راج کرنے لگتی ہے۔

قرون وسطی کے سماج میں ، اور خاص طور پر اس کی ابتدائی صدیوں میں ، پیداوار بنیادی طور پر فرد کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ھوتی تھی۔ زیادہ‌تر وہ صرف پیدا کرنےوالے کی اور اس کے خاندان کی ضروریات پوری کرتی تھی۔ جہاں شخصی تابعداری کے تعلقات رائج تھے ، مثلاً دیہات میں ، وہاں پیداوار جاگیردار رئیس کی ضروریات کی آسودگی میں بھی مدد کرتی تھی۔ ان سب چیزوں میں تبادلے کا کوئی سوال نہیں تھا لہذا پیداشدہ اشیا نے جنس تبادلہ کا کردار اختیار نہیں کیا۔ کسان کا خاندان اپنی ضرورت کی تقریباً ہر چیز — کھانا ، کپڑا اور اسباب خانہ‌داری — پیدا کر لیتا تھا۔ جب اس نے اپنی ضروریات کی آسودگی کے لئے اور جاگیردار کی ادائگی بالجنس کے لئے جتنا کچھ ضروری تھا اس سے زیادہ پیدا کرنا شروع کیا ، صرف اسی وقت اس نے جنس تبادلہ بھی پیدا کی۔ یہ زائد مقدار سماجی تبادلے میں شامل ھوکر اور بکاؤ چیز کی حیثیت اختیار کرکے جنس تبادلہ بن گئی۔

یہ ٹھیک ھے کہ شہروں کے کاریگروں کو شروع ھی سے تبادلے کے لئے اشیا پیدا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ بھی زیادہ‌تر اپنی ذاتی ضروریات خود ھی پوری کرتے تھے۔ ان کے پاس باغ اور زمین کے قطعے ھوتے تھے۔ وہ اپنے مویشیوں کو پنچائتی جنگل میں چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے اور اسی جنگل سے انھیں عمارتی لکڑی اور ایندھن بھی مل جاتا تھا۔ عورتیں کتائی کرتی اور اون وغیرہ بنتی تھیں۔ تبادلے کی خاطر پیداوار ، یعنی جنس تبادلہ کی پیداوار عالم طفلی میں تھی۔ یہی وجہ ھے کہ تبادلہ محدود ، منڈی چھوٹی اور پیداوار کے طریقے پائدار تھے۔ بیرونی دنیا کی طرف مقامی خلوت پسندی کا رویہ تھا اور اندر مقامی اتحاد ، دیہات میں مارک* تھا اور قصبے میں گلڈ۔

---

* یہاں اینگلس نے اپنی تصنیف ”مارک“ کا حوالہ دیا ھے۔ دیکھئے تشریحی نوٹ نمبر ۵۔ (ایڈیٹر)

لیکن جنس تبادلہ کی پیداوار کی توسیع اور خاص طور پر سرمایہ‌داری طریق پیداوار کی ترویج کے ساتھ، جنس تبادلہ کی پیداوار کے قوانین جو ابھی تک خوابیدہ و پنہاں تھے، زیادہ کھلے طور پر اور زیادہ زور شور کے ساتھ مصروف عمل ہونے لگے۔ پرانے بندھن ڈھیلے ہوگئے، پرانی مخصوص حدبندیاں ٹوٹ گئیں اور پیدا کرنےوالے روزافزوں طور پر خودمختار اور علیحدہ علیحدہ جنس تبادلہ پیدا کرنے والوں میں تبدیل ہونے لگے۔ صاف ظاہر ہوگیا کہ مجموعی طور پر سماج کی پیداوار میں منصوبے کی غیرموجودگی، اتفاقات اور نراج کا دور دورہ ہے، اور یہ افراتفری زیادہ سے زیادہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ لیکن وہ خاص ذریعہ، جس کی مدد سے سرمایہ‌داری طریق پیداوار نے سماجی پیداوار کے اس نراج کو زیادہ شدید اور تیز بنایا، دراصل نراج کی عین ضد تھا — اور وہ ذریعہ تھا ہر ایک پیداواری کارخانے میں روزافزوں طور پر پیداوار کا سماجی بنیاد پر منظم کیا جانا۔ اس چیز نے پرانے، پرسکون اور پائدار حالات کا خاتمہ کردیا۔ جہاں کہیں بھی صنعت کے کسی شعبے میں پیداوار کی اس تنظیم کو رواج دیا گیا اس نے اپنے پہلو بہ پہلو پیداوار کے اور کسی طریقے کو برداشت نہیں کیا۔ محنت کا میدان میدان جنگ بن گیا۔ عظیم جغرافیائی دریافتوں (۵۶) اور ان کے بعد نوآبادیات نے منڈیوں کی تعداد بڑھا دی اور دستکاری کے کارخانہ‌داری میں تبدیل ہونے کے عمل کو تیزتر کردیا۔ اور محض مختلف بستیوں کے انفرادی پیدا کرنےوالوں ہی کےدرمیان جنگ نہیں چھڑی — مقامی جنگوں نے قومی آویزشوں کو، سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی تجارتی جنگوں کو جنم دیا (۵۷)۔

علاوہ بریں جدید صنعت اور عالمی منڈی نے اس کشمکش کو عالمگیر بنادیا اور ساتھ ہی ساتھ اسے ایک غیرمعمولی توانائی بھی عطا کردی۔ اب پیداوار کے فطری اور مصنوعی حالات کی فوقیت اور برتری انفرادی سرمایہ‌داروں اور اسی کےساتھ تمام کی تمام صنعتوں اور ملکوں کے عدم اور وجود کا فیصلہ کرتی ہے۔ جو گرتا ہے اسے بےرحمی سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ یہ ڈارون کے نظرئے کے مطابق وہی فرد کی زندہ رہنے کی کوشش ہے جو زیادہ شدت کےساتھ فطرت سے سماج

کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ حیوان کےلئے جو حالاتِ زندگی فطری ہیں وہ ارتقائے انسانی کےلئے حرفِ آخر کی حیثیت سے سامنے آنے لگے ہیں۔ سماجی پیداوار اور سرمایہ‌داری تصرف اور ملکیت کا تضاد اب الگ الگ کارخانوں میں پیداوار کی تنظیم اور عام طور پر سماج میں پیداوار کے نراج کے درمیان آویزش کی شکل میں اپنا اظہار کرتا ہے۔

سرمایہ‌داری طریقِ پیداوار آویزش اور تناتنی کی انہیں دو شکلوں میں حرکت کرتا رہتا ہے جو پیدائش کے وقت سے ہی اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ کبھی بھی اس ”دائرۂ ناسعقول“ سے باہر نہیں نکل سکتا جو فورئے نے پہلے ہی دریافت کرلیا تھا۔ اصل میں فورئے اپنے زمانے میں جو چیز نہیں دیکھ سکا وہ یہ تھی کہ یہ دائرہ رفتہ رفتہ تنگ ہوتا جا رہا ہے، حرکت روز بروز ایک مخروطی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، اور اسے بھی سیاروں کی حرکت کی طرح مرکز سے تصادم ہونے پر کبھی نہ کبھی ضرور ختم ہونا ہے۔ پورے سماج کی پیداوار میں جو نراج ہے اس کی دباؤ ڈالنے والی قوت انسانوں کی اکثریت کو زیادہ سے زیادہ پرولتاریوں میں تبدیل کرتی جا رہی ہے، اور دوسری طرف یہی پرولتاری ہیں جو آخرکار پیداوار کے اس نراج کا خاتمہ کریں گے۔ سماجی پیداوار میں جو افراتفری ہے اس کی دباؤ ڈالنے والی قوت ہی، جدید صنعت کے تحت مشینوں کی بے پناہ تکمیل پذیری کو ایک جبری قانون میں تبدیل کرتی ہے جس کی رو سے ہر سرمایہ‌دار کے لئے اپنی مشینوں کو روزافزوں طور پر بہتر سے بہتر بنانا ضروری ہوتا ہے، ورنہ تباہی اور بربادی اس کا مقدر ہوجاتی ہے۔

لیکن مشینوں کی تکمیل انسانی محنت کو ایک مدزائد بنا رہی ہے۔ اگر مشینوں کی ترویج اور توسیع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مشین پر کام کرنےوالے چند مزدور ہاتھ سے کام کرنےوالے لاکھوں محنت کشوں کی جگہ لےلیں، تو مشینوں میں اور زیادہ ترقی ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ خود مشین پر کام کرنےوالے مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ نکالا جائے۔ علاوہ‌بریں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اجرتی مزدوروں کی ایک تعداد سرمائے کی اوسط ضروریات سے زیادہ ہوجاتی ہے، اور اس کا مطلب ہے صنعتی مزدوروں کی ایک ریزرو فوج کی تشکیل

(۱۸۴۵ ء میں میں نے اسے یہ نام دیا تھا *) جو صنعت کے نہایت سرگرمی اور تیزی سے کام کرنے کے زمانے میں استعمال ہوتی ہے ، اور جسے ناگزیر کاروباری تباہی کے رونما ہوتے ہی اٹھاکر سڑک پر پھینک دیا جاتا ہے - یہ محفوظ فوج مزدور طبقے کی سرمائے کےخلاف جھدبقا میں اس کے اوپر ایک بھاری بوجھ کی طرح موجود رہتی ہے اور سرمائے کے مفاد کے مطابق اجرت کو نیچی سطح پر قائم رکھنے کا ایک آلہ ہے - سو اس طور پر ، مارکس کے الفاظ میں ، مشینیں مزدور طبقے کےخلاف سرمائے کی جنگ میں انتہائی طاقتور ھتھیار بن‌جاتی ھیں ، آلات محنت مسلسل مزدور کے ھاتھ سے اس کی روزی کے وسیلے چھینتے رہتے ھیں ، اور خود مزدور تیار کی ھوئی چیز اس کو ماتحتی میں رکھنے کا آلہ بن‌جاتی ہے - سو اس طور پر آلات محنت کی کفایت ، شروع ھی سے ، بیک‌وقت قوت محنت کی انتہائی لاابالی فضول خرچی بھی بن‌جاتی ہے ، اور ان نارمل حالات پر مبنی ڈاکہ بھی جن کے تحت محنت مصروف‌کار ھوتی ہے - مشین یعنی ”محنت کے وقت میں کمی کرنے کا سب سے زیادہ طاقتور ھتھیار ، اس چیز کا انتہائی کارگر ذریعہ بن جاتی ہے کہ مزدور اور اس کے خاندان کے وقت کا ایک ایک لمحہ سرمایہ‌دار کے اختیار میں ھو ، تاکہ وہ اپنے سرمائے کی قدر میں اضافہ کر سکے“ - (”سرمایہ“ - انگریزی ایڈیشن ، جلد اول ، صفحہ ۴۰۶ -) سو اس طرح کچھ لوگوں کا حد سے زیادہ کام کرنا دوسرے لوگوں کے بیکار محض رہنے کی لازمی شرط بن‌جاتا ہے ، اور جدید صنعت ، جو دنیا بھر میں نئے خرچ کرنےوالوں کی تاک میں رہتی ہے ، اپنے ملک کی جنتا کے صرف کو فاقہ کشی کی سطح تک پہنچا دیتی ہے ، اور ایسا کرنے میں خود اپنی گھریلو منڈی کو تباہ کر دیتی ہے - ”وہ قانون جو نسبتاً زائد آبادی — یا صنعتی ریزرو فوج کے — اور سرمایہ جمع ھونے کی مقدار اور طاقت کےدرمیان ھمیشہ توازن قائم رکھتا ہے ، وھی قانون مزدور کو سرمائے کی زنجیروں میں اس قدر مضبوطی سے باندھ دیتا

---

* ”انگلینڈ میں مزدور طبقے کی حالت“ (”سونن شائن اینڈ کو“ کا ایڈیشن) ، صفحہ ۸۴ - (اینگلس کا نوٹ)

ہے کہ اتنی مضبوطی سے ولکان نے بروسیتھیس کو بھی چٹان سے نہ باندھا ہوگا۔ یہ قانون سرمایہ کے اجتماع کے تناسب سے مصائب کے اجتماع کو بھی جنم دیتا ہے۔ لہذا ایک سرے پر دولت کا اجتماع ہوتا ہے اور اس کے متضاد سرے پر بیک وقت مصائب، محنت کے کرب، غلامی، جہالت، درندگی اور ذہنی پستی کا — اور یہ سب اس طبقے کے حصے میں آتا ہے جو اپنی محنت کا حاصل سرمائے کی شکل میں پیدا کرتا ہے۔،، (مارکس، ''سرمایہ،، (''سونن شائن اینڈ کو،، کا ایڈیشن) صفحہ ٦٦١ -) اور سرمایہ‌داری طریق پیداوار سے پیداشدہ اشیا کی کسی اور تقسیم کی توقع کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک بیٹری کے برقیروں (electrodes) سے یہ توقع کی جائے کہ وہ بیٹری سے منسلک ہونے کی صورت میں تیزاب‌دار پانی کو تحلیل نہ کریں اور آکسیجن کو اپنے مثبت قطب پر اور ہائیڈروجن کو منفی قطب پر پانی سے خارج نہ کریں۔

ہم نے دیکھا کہ جدید مشینوں کی روزافزوں تکمیل‌پذیری، سماجی پیداوار کے نراج کے ذریعے، ایک جبری قانون میں تبدیل ہو جاتی ہے جو ہر صنعتی سرمایہ‌دار کو ہمہ‌وقت اپنی مشینوں کو ترقی دینے اور ان کی پیداواری قوت بڑھاتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ محض پیداوار کا میدان وسیع کرنے کا امکان بھی اس کے لئے ایک ایسے ہی جبری قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جدید صنعت کی بےحد بڑی توسیع پذیر قوت، جس کے مقابلے میں گیسوں کے پھیلنے کی قوت بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے، اب ہمیں مقدار اور ماہیت دونوں کی توسیع کی ناگزیر ضرورت معلوم ہوتی ہے جو کسی قسم کی مزاحمت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ یہ مزاحمت صرف، فروخت اور جدید صنعت کی پیداوار کی منڈیوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ لیکن منڈیوں کی فراخ اور عمیق، دونوں قسم کی توسیع کی صلاحیت کا انحصار بنیادی طور پر قطعی مختلف قوانین پر ہے جو اس سے کہیں کم توانائی کے ساتھ مصروف عمل ہوتے ہیں۔ منڈیوں کی توسیع پیداوار کی توسیع کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے، اور چونکہ جب تک یہ تصادم سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار کا پوری طرح تختہ نہ الٹے اس وقت تک وہ کوئی معقول حل پیش نہیں کر سکتا، لہذا یہ تصادم

باربار ہونے لگتا ہے۔ سرمایہ‌داری پیداوار نے ایک اور '' دائرۂ‌نامعقول ،، کو جنم دے دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۲۵ ء سے لے کر ، جب کہ پہلا عام بحران نمودار ہوا تھا ، اب تک تمام صنعتی اور تجارتی دنیا میں ، تمام مہذب قوموں اور ان کے کم و بیش نامہذب طفیلیوں کے درمیان ، تقریباً ہر دس سال بعد ساری پیداوار اور تبادلہ کی چولیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ تجارت کا بازار مندا پڑ جاتا ہے ، منڈیاں ٹھساٹھس بھر جاتی ہیں ، اشیائے تبادلہ جتنی ناقابل فروخت ہوتی ہیں اسی قدر ان گنت اور بےشمار بھی ہوتی ہیں ، زرنقد غائب ہو جاتا ہے ، کوئی قرض دینے پر تیار نہیں ہوتا ، کارخانے بند ہونے لگتے ہیں ، مزدوروں کی بڑی تعداد کے پاس ذرائع زندگی نہیں ہوتے کیونکہ انھوں نے بہت زیادہ ذرائع زندگی پیدا کر دئے ہیں۔ دیوالوں پر دیوالے نکلنے لگتے ہیں اور قرقی کا سلسلہ بندھ جاتا ہے۔ یہ جمود کئی سال تک باقی رہتا ہے۔ پیداوار اور پیداواری قوتیں بہت بڑی تعداد میں ضائع اور برباد ہوتی ہیں ، یہاں تک کہ جمع‌شدہ مالوں کی قیمت کم و بیش گھٹنے کے بعد آخرکار رفتہ رفتہ ان کی نکاسی ہونے لگتی ہے اور عمل پیداوار اور تبادلہ دونوں رفتہ‌رفتہ ایک دفعہ پھر حرکت میں‌آتے ہیں۔ آہستہ آہستہ چال تیز ہوتی ہے۔ وہ دلکی چال بن جاتی ہے ، صنعتی دلکی چال بڑھ کر پویہ بن جاتی ہے اور پویہ تیز ہو کر صنعت ، تجارتی قرض اور سٹہ‌بازی کی بہترین سرپٹ گھوڑدوڑ میں تبدیل ہو جاتی ہے جو بالاخر انتہائی تیز چھلانگوں کے بعد اسی جگہ ختم ہوتی ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی — یعنی بحران کی خندق میں۔ اور باربار یہی ہوتا رہتا ہے۔ ۱۸۲۵ ء سے لے کر اب تک ہم پانچ مرتبہ اس چکر سے گذر چکے ہیں ، اور اس وقت (۱۸۷۷ ء میں) چھٹی بار اس سے گذر رہے ہیں۔ اور ان بحرانوں کا کردار اس قدر صاف اور واضح ہے کہ فورئیے نے پہلے بحران کو '' افراط کا بحران ،، کہہ کر ان سب کی صحیح تعریف کر دی۔

سماجی پیداوار اور سرمایہ‌داری ملکیت اور تصرف کے درمیان جو تضاد ہے وہ ان بحرانوں میں ایک بڑے تند و تیز دھماکے پر ختم ہوتا ہے۔ وقتی طور پر اجناس تبادلہ کی گردش ختم ہو جاتی ہے۔

زر جو اشیا کی گردش کا ذریعہ ہے گردش کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ جنس تبادلہ کی پیداوار اور گردش کے تمام قانون الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔ معاشی تصادم اپنے منتہا تک پہنچ جاتا ہے: طریق پیداوار طریق تبادلہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتا ہے۔

یہ حقیقت کہ کارخانے کے اندر پیداوار کی سماجی تنظیم نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ وہ سماج کی پیداوار کے اس نراج سے بالکل میل نہیں کھاتی جو اس تنظیم کے پہلو بہ پہلو موجود ہے اور اس پر چھائی رہتی ہے — اس حقیقت کا احساس خود سرمایہ داروں کو بحرانوں کے وقت بہت سے نڑے، اور اس سے بھی زیادہ تعداد میں چھوٹے سرمایہ داروں کی بربادی کے باعث ہونے والی سرمائے کی شدید مرکزیت کے ذریعے ہوتا ہے۔ سرمایہ داری طریق پیداوار کا تمام نظام پیداواری قوتوں کے دباؤ سے، جو خود اس طریق پیداوار کی تخلیق ہیں، ٹوٹ جاتا ہے۔ اب وہ ذرائع پیداوار کے اس تمام انبار کو سرمائے کی شکل دینے سے قاصر ہو گیا ہے۔ اور یہ ذرائع پیداوار بے استعمال پڑے رہتے ہیں اور اسی لئے صنعتی فوج محفوظ بھی لازماً بے استعمال پڑی رہتی ہے۔ ذرائع پیداوار، ذرائع زندگی، موجود و دستیاب مزدور، پیداوار اور عام دولت کے تمام عناصر بہ افراط موجود ہیں۔ لیکن یہ ”افراط پریشانی، افلاس اور احتیاج کا سرچشمہ بن جاتی ہے،“ (فورئیر) کیونکہ ٹھیک یہ افراط ہی وہ چیز ہے جو ذرائع پیداوار اور ذرائع زندگی کے سرمائے کی شکل اختیار کرنے میں مانع ہے۔ چونکہ سرمایہ داری سماج میں ذرائع پیداوار صرف اسی وقت اپنا کام انجام دے سکتے ہیں جب کہ وہ ابتدائی طور پر سرمائے، یعنی انسانی قوت محنت کے استحصال کے ذریعے میں، تبدیل ہو چکے ہوں۔ ذرائع پیداوار اور ذرائع زندگی کے سرمائے میں تبدیل ہونے کی ناگزیر ضرورت ان ذرائع کے اور مزدوروں کے درمیان ایک دیوار بنی کھڑی ہے۔ صرف یہی چیز ہے جو پیداوار کے مادی اور انسانی محرکوں کے یکجا ہونے میں مانع ہے اور صرف یہی چیز ذرائع پیداوار کو اپنا کام انجام دینے کی اور مزدوروں کو کام کرنے اور زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ لہذا ایک طرف تو سرمایہ داری طریق پیداوار ان پیداواری قوتوں کی قیادت کرنے کی نااہلی کے جرم میں ماخوذ نظر

آتا ہے ، اور دوسری طرف خود یہ پیداواری قوتیں روزافزوں زور اور قوت کے ساتھ دباؤ ڈالتی ہیں تا کہ اس تضاد کا خاتمہ ہو جائے ، ان پیداواری قوتوں کی سرمائےوالی حیثیت اور خصوصیت ختم ہوجائے ، اور ان کا یہ کردار عملی طور پر تسلیم کرلیاجائے کہ وہ سماجی پیداواری قوتیں ہیں۔

پیداواری قوتوں کے روزافزوں طاقتور ہوتے جانے کے ساتھ ساتھ ، ان کی خود اپنی سرمائے والی حیثیت اور خصوصیت کے خلاف بغاوت ، اور یہ مسلسل بڑھتا ہوا مطالبہ کہ ان کا سماجی کردار تسلیم کیا جائے ، سرمایہ‌دار طبقے کو مجبور کرتا ہے کہ ، جہاں تک سرمایہ‌داری حالات کے تحت ممکن ہے ، وہ ان سے روزبروز زیادہ سے زیادہ سماجی پیداواری قوتوں کا سا سلوک کرے۔ ایک طرف تو صنعتی گرم‌بازاری کے دور میں جب قرضے کی لامحدود افراط ہوتی ہے اور دوسری طرف کاروبار کی مکمل تباہی میں بڑے بڑے سرمایہ‌داری اداروں کی بربادی کے باعث ، ذرائع‌پیداوار کی بڑی اکثریت کے وہ سماجی شکل اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے ، جو ہمیں مختلف قسم کی سرمایۂ مشترک (joint -stock) کی کمپنیوں میں ملتی ہے۔ ان ذرائع پیداوار اور ذرائع‌نقل و حمل کی ایک بڑی تعداد شروع ہی سے اس قدر دیوہیکر ہوتی ہے کہ ، ریلوں کی طرح ، وہ سرمایہ‌داری استحصال کی اور کسی شکل کے لئے گنجائش ہی نہیں چھوڑتی۔ ارتقا کی ایک اور اگلی منزل پر یہ شکل بھی ناکافی ہو جاتی ہے۔ ایک ملک میں بڑے پیمانے کے ایک شعبۂ صنعت کے مالک مل کر ایک ”ٹرسٹ،، بنا لیتے ہیں — یہ اتحاد پیداوار میں باقاعدگی پیدا کرنے کےلئے ہوتا ہے۔ یہ لوگ کل پیداوار کی مقدار کا تعین کرتے ہیں اور اس کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں ، اور اس طرح پہلے سے طےشدہ قیمت‌فروخت عائد کر دیتے ہیں۔ لیکن جوں ہی کاروبار مندا پڑنے لگتا ہے اس قسم کی ٹرسٹ کا عام طور پر شیرازہ بکھرنے لگتا ہے ، اور ٹھیک اسی وجہ سے وہ مجبوراً اجتماع کی مزید مرکزیت کو بروئےکار لاتی ہے : وہ پوری کی پوری صنعت ایک بہت لمبی چوڑی سرمایۂ مشترک کی کمپنی میں تبدیل ہو جاتی ہے ، اندرونی مقابلے کی جگہ اب اس ایک کمپنی کا اندرونی اجارہ لے لیتا ہے۔ ۱۸۹۰ ء میں انگریزی القلی کی

پیداوار کے ساتھ ایسا ہی ہوا ، اور ۴۸ بڑے بڑے کارخانوں کے مل کر ایک ہو جانے کے بعد اب وہ ایک کمپنی کے ہاتھ میں ہے ، صرف ایک منصوبے کے مطابق منظم کی جاتی ہے اور اس کے پاس ساٹھ لاکھ پاؤنڈ کا سرمایہ ہے۔

ٹرسٹ میں مقابلے کی آزادی اپنی ضد — یعنی اجارے کی آزادی — کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور سرمایہ‌داری سماج کی پیداوار ، جو کسی مقررہ منصوبے پر مبنی نہیں ہوتی ، آنے‌والے سوشلسٹ سماج کی ایک مقررہ منصوبے پر مبنی پیداوار کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس حد تک یہ چیز سرمایہ‌داروں کے فائدے اور منافع ہی کی ہے۔ لیکن اس صورت میں استحصال اس قدر صریحی اور نمایاں ہے کہ اس کا خاتمہ لازمی ہو جاتا ہے۔ کوئی قوم ٹرسٹ کی منظم کردہ پیداوار کو برداشت نہیں کر سکتی ، جس میں منافع خوروں کی ایک چھوٹی سی ٹولی پورے سماج کا اس قدر ڈھٹائی سے استحصال کرتی ہے۔

بہرصورت ٹرسٹ ہوں یا نہ ہوں ، سرمایہ‌داری سماج کے سرکاری نمائندے — ریاست — کو کبھی نہ کبھی پیداوار کی نگرانی اور رہنمائی اپنے ذمے لینی ہی ہوگی*۔ ریاستی ملکیت میں تبدیل ہونے کی یہ

---

* میں کہتا ہوں "لینی ہی ہوگی"، کیونکہ جب ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم واقعی سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں کے انتظام کی حد سے کہیں آگے نکل جائیں گے اور جب اسی وجہ سے ریاست کا ان کو اپنے ہاتھ میں لینا معاشی طور پر ناگزیر ہو جائے گا — خواہ موجودہ ریاست ہی یہ کام انجام دے — صرف اسی صورت میں یہ معاشی ترقی ہوگی ، صرف اسی وقت یہ ایک اور ابتدائی قدم ہوگا جو خود سماج کے تمام پیداواری قوتوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے ضروری ہے۔ جب سے بسمارک نے کچھ صنعتی اداروں کو ریاستی ملکیت بنایا اس وقت سے ایک قسم کا نقلی سوشلزم ابھر رہا ہے جو اکثر و بیشتر رو بہ تنزل ہو کر ایک طرح کا خوشامدی‌پن بن جاتا ہے اور جو نہایت اطمینان سے ہر قسم کی ریاستی ملکیت کو ، یہاں تک کہ بسمارک کی قسم کی ریاستی ملکیت کو بھی ، سوشلسٹ قرار دے دیتا ہے۔

ضرورت سب سے پہلے آمد و رفت، رسم و راہ اور رسل و رسائل کے عظیم اداروں — پوسٹ آفس، ٹیلیگراف اور ریلوں — میں محسوس کی جاتی ہے۔

اگر بحران بورژوا طبقے کی جدید پیداواری قوتوں کی نگرانی اور انتظام کرنے کی موجودہ نااہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو پیداوار اور تقسیم کے بڑے بڑے اداروں کا سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں، ٹرسٹ اور ریاستی ملکیت کی شکل اختیار کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ بورژوا طبقہ اس مقصد کے لئے کس درجہ غیرضروری ہے۔ سرمایہ‌داروں کے تمام سماجی کام اب تنخواہ‌دار ملازمین انجام دیتے ہیں۔ اب سرمایہ‌دار کا اس کے علاوہ اور کوئی سماجی کام باقی نہیں رہا کہ وہ منافع کی رقمیں اپنی جیب میں پہنچائے، کوپن پھاڑے اور اسٹاک اکسچینج میں جوا کھیلے جہاں مختلف سرمایہ‌دار ایک دوسرے

اور اگر ریاست کا تمباکو کی صنعت کو اپنے ہاتھ میں لینا سوشلسٹ قدم ہے تو یقیناً نپولین اور میٹرنک کا شمار سوشلزم کے بانیوں میں ہونا چاہئے۔ اگر بلجیم کی ریاست نے بالکل معمولی سیاسی اور مالی وجوہ کی بنا پر خود اپنی سب سے اہم ریلوے لائنیں تعمیر کیں اور اگر بسمارک نے ریاست کے نام پر سب سے اہم پروشین ریلوے لائنیں اپنے ہاتھ میں لے لیں — کسی معاشی مجبوری کی بنا پر نہیں، بلکہ محض اس لئے کہ جنگ کی صورت میں ریلیں زیادہ اچھی طرح اس کے قبضے میں ہوں، ریلوے کے ملازمین کو گورنمنٹ کے لئے ووٹ دینے والے مویشیوں کی طرح تیار کیا جا سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود پارلیمنٹ کی اجازت کا محتاج نہ رہ کر اپنے لئے ایک اور علیحدہ ذریعۂ آمدنی پیدا کر سکے — تو کسی لحاظ سے بھی، براہ‌راست یا بالواسطہ، شعوری یا غیرشعوری طور پر، غرض کسی طرح بھی یہ کوئی سوشلسٹ قدم نہیں تھا۔ ورنہ شاہی بحری تجارت (۵۸)، رائل چینی کے برتنوں کی صنعت، اور یہی نہیں بلکہ فوج کی رجمنٹ کا درزی خانہ بھی سوشلسٹ ادارے مانے جائیں‌گے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ریاست کا قحبہ‌خانوں کو اپنے ہاتھ میں لینا بھی — جیسا کہ فریڈرک ولیم سوئم کے عہد حکومت میں ایک چھپے رستم نے سنجیدگی سے تجویز پیش کی تھی۔ (اینگلس کا نوٹ)

کا سرمایہ لوٹتے رہتے ہیں۔ شروع میں سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار مزدوروں کو نکال پھینکتا ہے اور اب سرمایہ‌داروں کو نکال پھینکتا ہے۔ اور جس طرح اس نے مزدوروں کو جبراً فاضل آبادی کی صف میں لا ڈالا تھا اسی طرح اب وہ سرمایہ‌داروں کے ساتھ بھی کرتا ہے، اگرچہ آخرالذکر کو فوراً صنعتی محفوظ فوج کی صفوں میں نہیں ڈالتا۔

لیکن پیداواری قوتیں خواہ سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں اور ٹرسٹ کی شکل اختیار کریں خواہ وہ ریاستی ملکیت میں تبدیل ہو جائیں، بہرصورت اس سے ان کا سرمایہ‌داری کردار ختم نہیں ہوتا۔ سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں اور ٹرسٹ میں تو یہ بات بالکل صاف ہے۔ اور رہی جدید ریاست، سو وہ محض بورژوا سماج کی وہ تنظیم ہے جو یہ سماج سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار کے خارجی حالات کو ایک طرف الگ الگ سرمایہ‌داروں کی اور دوسری طرف مزدوروں کی دست‌درازی سے محفوظ رکھنے کے لئے بناتا ہے۔ جدید ریاست کی شکل خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، بنیادی طور پر وہ ایک سرمایہ‌داری سیاسی نظام، سرمایہ‌داروں کی ریاست، کل قومی سرمائے کا معیاری اظہار ہے۔ جتنا جتنا وہ پیداواری قوتوں کو اپنے ہاتھ میں لیتی جاتی ہے، اتنا ہی زیادہ وہ دراصل قومی سرمایہ‌دار بنتی جاتی ہے اور اتنے ہی زیادہ شہریوں کا استحصال کرتی ہے۔ مزدور اجرتی مزدور — پرولتاری ہی رہتے ہیں۔ سرمایہ‌داری تعلق ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ تو کچھ اور بھی شدید ہو جاتا، اور انتہا پر پہنچنے کے بعد دھڑام سے گر کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ پیداواری قوتوں کا ریاستی ملکیت ہونا کشمکش اور آویزش کا حل نہیں ہے، لیکن اس کے اندر وہ امکانی حالات مضمر ہیں جو اس حل کو ممکن بناتے ہیں۔

اور یہ حل مشتمل ہو سکتا ہے صرف جدید پیداواری قوتوں کے سماجی کردار کے عملی اعتراف پر، دوسرے الفاظ میں طریق‌پیداوار، طریق تبادلہ اور طریق‌تصرف کو ذرائع پیداوار کے سماجی کردار سے ہم‌آہنگ کرنے پر۔ اور یہ صرف اسی صورت میں بروئے‌کار آسکتا ہے کہ سماج کھلم کھلا اور براہ‌راست پیداواری قوتوں پر قابض ہو جائے، جو اب اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہیں کہ پورے سماج کی نگرانی کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کی نگرانی عائد نہیں کی جا سکتی۔ موجودہ

زمانے میں ذرائع پیداوار اور پیداوار کا سماجی کردار خود پیدا کرنے والوں کے خلاف عمل کرتا ھے ، وہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد تمام پیداوار اور تبادلے کو درھم برھم کر دیتا ھے اور صرف کسی قانون فطرت کی طرح ، اندھادھند اور جبری اور تخریبی طور پر اپنا کام کرتا ھے۔ لیکن سماج کے پیداواری قوتوں کو اپنے ھاتھ میں لے لینے کے بعد پیدا کرنے والے ، ذرائع پیداوار اور پیداوار کے سماجی کردار کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے ، اس کو مفید مصرف میں لائیں گے ، اور یہ سماجی کردار ، تھوڑی تھوڑی مدت بعد واقع ھونے والی تباھیوں اور ابتری کا سرچشمہ ھونے کے بجائے ، خود پیداوار کی توسیع و ترقی کا ایک زبردست آلہ بن جائے گا۔

سماجی قوتیں اس وقت تک بالکل فطری قوتوں کے مانند اندھادھند اور جبری اور تخریبی طور پر مصروف کار ھوتی ھیں جب تک کہ ھم انہیں سمجھتے اور اھمیت نہیں دیتے۔ لیکن جب ھم ایک دفعہ ان کو سمجھ لیتے ھیں اور ھمیں ان کے عمل ، ان کے رخ اور ان کے اثرات کا شعور اور ادراک ھو جاتا ھے تو اس وقت ان کو روزافزوں طور پر اپنے ارادے کے تابع کرنا اور ان کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنا صرف ھمیں لوگوں پر منحصر ھوتا ھے۔ اور موجودہ زمانے کی عظیم پیداواری قوتوں پر یہ بات اور بھی زیادہ صادق آتی ھے۔ جب تک ھم ھٹ دھرمی سے ان سماجی ذرائع عمل کی فطرت اور کردار کو سمجھنے سے انکار کرتے رھیں گے — اور ان کو سمجھنا سرمایہ داری طریق پیداوار اور اس کے حامیوں کی سرشت کے خلاف ھے — اس وقت تک یہ پیداواری قوتیں ھم سے بے تعلق اور ھماری مخالفت میں مصروف عمل رھیں گی اور ھمارے اوپر حکومت کرتی رھیں گی جیسا کہ ھم نے ابھی تفصیل سے دکھایا ھے۔

لیکن ایک دفعہ ان کی فطرت کو سمجھ لیا جائے تو وہ ساتھ مل کر اشیا پیدا کرنے والوں کے لئے حکمران عفریتوں کے بجائے آمادۂ خدمت موکل بن جائیں گی۔ یہ وھی فرق ھے جو طوفان برق و باراں میں کوندنے والی بجلی اور انسانی نگرانی کے تحت تاربرقی اور آرک لیمپ میں مستعمل بجلی میں ھے ، جو آتش زدگی اور انسان کی خدمت کرنے والی آگ کے درمیان ھے۔ جب آخرکار آج کی پیداواری قوتوں

کی اصلی فطرت پہچان اور مان لی جاتی ھے ، تو پیداوار کی سماجی افراتفری پیداوار کے سماجی نظم اور باقاعدگی کے لئے جگہ خالی کر دیتی ھے ، جو تمام افراد اور سماج کی ضروریات کے مطابق اور ایک مقررہ منصوبے پر مبنی ھوتی ھے - تب سرمایہ‌داری طریق تصرف کی جگہ ، جس میں پیداوار پہلے تو پیدا کرنے والے کو غلام بناتی ھے اور پھر تصرف کرنے والے کو ، پیداوار کا ایک ایسا طریق تصرف لے لیتا ھے جو جدید ذرائع پیداوار کے کردار پر مبنی ھوتا ھے — ایک طرف تو براہ‌راست سماجی تصرف جو پیداوار کے قیام اور توسیع کا ذریعہ ھے ، اور دوسری طرف براہ‌راست انفرادی تصرف ، جو وسیلۂ حیات اور ذریعۂ مسرت ھے -

آبادی کی اکثریت کو روزافزوں طور پر مکمل پرولتاری بنانے کے ساتھ ساتھ سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار اس قوت کی تخلیق بھی کرتا ھے جو اس انقلاب کو برروئے‌کار لانے پر مجبور ھے اور اگر ایسا نہ کرے تو خود اس کی تباھی آجائےگی - سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار ان وسیع ذرائع پیداوار کو ، جو پہلے ھی سماجی ڈھنگ کے ھو چکے ھیں ، ریاستی ملکیت کی شکل اختیار کرنے پر مجبور کرکے گویا خود ھی اس انقلاب کو برروئے‌کار لانے کا راستہ دکھاتا ھے - پرولتاری طبقہ سیاسی اقتدار اپنے ھاتھ میں لے لیتا ھے اور ذرائع پیداوار کو ریاست کی ملکیت بنا دیتا ھے -

لیکن ایسا کرنے کے دوران وہ خود کو پرولتاری طبقے کی حیثیت سے ختم کر دیتا ھے ، تمام طبقاتی امتیازات اور طبقاتی مخالفتوں کا قلع قمع کر دیتا ھے اور ریاست کو ریاست کی حیثیت سے ختم کر دیتا ھے - اب تک سماج کو ، جس کی بنیاد طبقاتی مخالفتوں پر تھی ، ریاست کی ضرورت تھی - اس کا مطلب یہ ھے کہ اسے اس خاص طبقے کی ایک تنظیم کی ضرورت تھی جو اپنے زمانے کا استحصالی طبقہ تھا ، ایک ایسی تنظیم کی ضرورت تھی جس کا مقصد مروجہ حالات‌پیداوار میں باھر سے ھر قسم کی مداخلت کی روک‌تھام کرنا تھا اور اسی لئے خاص طور پر مظلوم طبقوں کو جبر اور زبردستی سے ایک ایسی مظلوم ومجبور حالت میں رکھنا تھا جو اس زمانے کے طریق پیداوار سے

ہم‌آہنگ ہو (غلامی، زرعی غلامی، اجرتی محنت)۔ کہنے کو تو ریاست پورے سماج کی نمائندہ، پورے سماج کے متحد ہو کر ایک مرئی اور محسوس شکل پانے کا نام تھی۔ لیکن ریاست کی یہ حیثیت اسی حد تک تھی جس حد تک کہ یہ اس طبقے کی ریاست تھی جو وقتی طور پر پورے سماج کی نمائندگی کرتا تھا — قدیم زمانے میں یہ غلاموں کے مالکوں کی ریاست تھی، قرون وسطی میں جاگیردار رؤسا کی اور خود ہمارے وقت میں بورژوا طبقے کی۔ جب آخرکار ریاست واقعی پورے سماج کی نمائندہ ہو جاتی ہے تو خود اس کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ جس وقت کوئی ایسا سماجی طبقہ باقی نہیں رہتا جسے حلقہ‌بگوش یا ذلیل رکھنے کی ضرورت ہو، جس وقت طبقاتی حکومت، افراد کی جہد بقا جو ہماری پیداوار کے موجودہ نراج پر مبنی ہے، اور اس سے پیدا ہونے‌والے تصادم، زیادتیاں اور بےاعتدالیاں، یہ سب کچھ ختم ہوجاتا ہے، اس وقت کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جسے کچلا اور دبایا جائے اور ایک خاص جبری قوت یعنی ریاست کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہ پہلا قدم جس کے ذریعے ریاست خود کو واقعی پورے سماج کے نمائندے کی حیثیت بخشتی ہے — یعنی سماج کے نام پر ذرائع‌پیداوار کو اپنے ہاتھ میں لینے کا عمل — ریاست کی حیثیت سے اس کا آخری آزادانہ قدم بھی ہوتا ہے۔ یکے بعددیگرے تمام سماجی تعلقات میں ریاست کی دخل‌اندازی فضول اور غیرضروری ہوجاتی ہے اور پھر خود ہی ختم ہوجاتی ہے۔ اشیا کا انتظام اور نگرانی اور عمل‌پیداوار کی دیکھ‌بھال انسانوں پر حکومت کی جگہ لےلیتی ہے۔ ریاست کا ”انسداد“ نہیں ہوتا۔ اس کا پودا دھیرے دھیرے خود ہی سوکھ جاتا ہے۔ اس سے ”آزاد ریاست“ کے فقرے* کی ٹھیک ٹھیک قدروقیمت معلوم ہو سکتی ہے، ایک طرف تو یہ کہ بعض اوقات سیاسی پرچارک اس کا جائز استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ کہ دراصل سائنسی اعتبار سے یہ ایک ناکافی فقرہ ہے، علاوہ بریں نام نہاد نراجیوں کے اس مطالبے کی صحیح قیمت کا

---

* ملاحظہ ہو مارکس اور اینگلس کی منتخب تصانیف، حصۂ دوم، ماسکو کا اردو ایڈیشن۔ - (ایڈیٹر)

اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ یوں ہی بیٹھے بٹھائے ریاست کا صفایا کردیا جائے۔

جب سے سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار تاریخ کے میدان میں نمودار ہوا ہے اس وقت سے مختلف افراد اور فرقے کم و بیش دھندلے طریقے سے خواب دیکھتے آئے ہیں کہ مستقبل کا نصب‌العین یہ ہوگا کہ پورا سماج ذرائع‌پیداوار پر قابض ہوگا۔ لیکن وہ ممکن‌العمل اور تاریخی ضرورت صرف اسی وقت بن‌سکا جبکہ اس کے شرمندۂ تعبیر ہونے کےلئے حقیقی حالات موجود ہوئے۔ اور ہر سماجی ترقی کی طرح یہ نصب العین بھی انسانوں کے یہ بات سمجھ جانے سے کہ طبقوں کا وجود عدل اور مساوات وغیرہ کے منافی ہے ممکن‌العمل نہیں بنتا اور نہ ہی وہ انسانوں کی ان طبقات کو ختم کرنے کی آمادگی سے ممکن العمل بنتا ہے۔ وہ ممکن العمل بنتا ہے بعض نئے معاشی حالات کی بدولت۔ سماج کا استحصالی اور مظلوم، حاکم اور محکوم طبقات میں بٹنا پرانے وقتوں کی پیداوار کے محدود اور ناقص ارتقا کا لازمی نتیجہ تھا۔ جب تک کل سماجی محنت کی پیداوار اس سے کچھ ہی زیادہ رہےگی جتنی کہ سب کے محض زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے، اور اسی وجہ سے جب تک سماج کے اراکین کی بہت بڑی اکثریت کا تمام یا تقریباً تمام وقت محنت میں صرف ہوتا رہےگا، اس وقت تک لازمی طور پر سماج طبقات میں بٹا رہے گا۔ اس بڑی اکثریت کے پہلو بہ پہلو جو پوری طرح محنت کی زرخرید لونڈی ہے، ایک اور طبقہ ابھرتا ہے جو براہ‌راست پیدا کرنے والی محنت سے آزاد ہے اور سماج کے عام معاملات — یعنی محنت، ریاستی معاملات، قانون، سائنس اور آرٹ وغیرہ — کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ سو تقسیم‌محنت کا قانون طبقاتی تقسیم کی بنیاد ہے۔ لیکن یہ امر اس چیز میں مانع نہیں ہے کہ زور و زبردستی، ڈاکہ اور چالبازی، جعل‌سازی اور فریب کے ذریعے طبقات کی یہ تقسیم بروئےکار لائی جاتی ہے، یہ امر اس چیز میں مانع نہیں ہے کہ حکمران طبقہ جب ایک بار برسر اقتدار اور غالب ہو جاتا ہے تو وہ مزدور طبقے کی ہڈیوں پر اپنے اقتدار کی عمارت استوار اور مستحکم کرتا ہے، اور اپنی سماجی قیادت کو جنتا کے ایک بے تحاشا استحصال میں تبدیل کر دیتا ہے۔

لیکن اگر اس طرح پیش کئے جانے میں طبقاتی تقسیم کا کچھ تاریخی جواز ہے بھی تو محض ایک خاص مدت کے لئے اور چند مخصوص سماجی حالات کے تحت۔ اس کی بنیاد پیداوار کی قلت اور کمی پر تھی۔ اور جدید پیداواری قوتوں کا مکمل ارتقا اس کا خاتمہ کر دے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ سماج میں طبقات کے خاتمے کے لئے تاریخی ارتقا کا وہ درجہ موجود ہونا ایک لازمی شرط ہے جب کہ صرف کسی خاص حکمران طبقے کی موجودگی ہی نہیں بلکہ سرے سے حکمران طبقے کا وجود اور اسی لئے خود طبقاتی امتیازات کا وجود ہی فرسودہ اور متروک ہوگیا ہو۔ سو طبقات کے ختم ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ پیداوار کا ارتقا ایک ایسے مقام تک پہنچ چکا ہو جہاں ذرائع پیداوار اور پیدا شدہ اشیا پر سماج کے صرف ایک خاص طبقے کا تسلط اور تصرف اور اسی کے ساتھ ساتھ صرف ایک ہی طبقے کا سیاسی غلبہ اور تہذیبی اور عقلی رہبری کی اجارہ‌داری نہ صرف فضول اور غیرضروری ہو بلکہ معاشی، سیاسی اور عقلی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بن چکی ہو۔ اب عین وہ وقت آن پہنچا ہے۔ بورژوا طبقے کا سیاسی اور ذہنی دیوالیہ‌پن اب خود اس کے لئے بھی راز نہیں رہا ہے۔ اس کا معاشی دیوالیہ‌پن دس دس سال کے وقفے سے باقاعدگی کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔ ہر بحران میں سماج کا خود اپنی پیداواری قوتوں اور پیدا شدہ اشیا کے بوجھ کے نیچے، جنھیں وہ استعمال نہیں کر سکتا، دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ اس احمقانہ تضاد کے روبرو بے‌بس و لاچار کھڑا رہ جاتا ہے کہ پیدا کرنے والوں کے پاس صرف کرنے کو کچھ نہیں ہے کیونکہ صرف کرنے‌والے کمیاب ہیں۔ ذرائع پیداوار کی وسیع اور پھیلتی ہوئی قوت ان بندھنوں کو توڑ ڈالتی ہے جن میں سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار نے ان کو جکڑ رکھا تھا۔ ذرائع پیداوار کا ان بندھنوں سے آزاد ہونا پیداواری قوتوں کے مسلسل اور روزافزوں ارتقا کی اور اسی لئے خود پیداوار کی تقریباً لامتناہی افزائش کی اولین اور لازمی شرط ہے۔ اور یہی نہیں۔ ذرائع پیداوار کا سماجی ملکیت بن جانا صرف پیداوار کی موجودہ مصنوعی بندشوں کا خاتمہ ہی نہیں کرتا، بلکہ پیداواری قوتوں اور پیداشدہ اشیا کی صریحی فضول‌خرچی اور بربادی اور تاراجی کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے،

جو موجودہ زمانے میں پیداوار کا جزو لاینفک ہیں اور بحرانوں کے وقت اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہیں۔ علاوہ‌بریں ذرائع‌پیداوار کا سماجی ملکیت بن جانا موجودہ حکمران طبقوں اور ان کے سیاسی نمائندوں کے فضول اور احمقانہ اسراف کو ختم کر کے بہت سے ذرائع پیداوار اور اشیائے‌پیداوار کو پورے سماج کے استعمال کے لئے بچا لیتا ہے۔ سماجی پیداوار کے ذریعے سماج کے ہر فرد کے لئے نہ صرف ایک ایسی زندگی مہیا کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے جو مادی لحاظ سے مکمل طور پر موزوں اور بھرپور ہے اور روزبروز زیادہ بھربور ہوتی جاتی ہے، بلکہ ایک ایسی زندگی بھی ممکن ہوتی ہے جس میں ہر شخص کے لئے اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے آزادانہ ارتقا اور استعمال کا پورا موقع ہو — یہ امکان اب پہلی دفعہ پیدا ہوا ہے، لیکن اس وقت یہ واقعی موجود ہے۔ *

جب سماج ذرائع‌پیداوار پر قبضہ کرلیتا ہے تو جنس تبادلہ کی پیداوار ختم ہوجاتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اشیائے‌پیداوار کا پیدا کرنے‌والے پر غلبہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ سماجی پیداوار میں ایک باقاعدہ،

---

* یہ چند اعدادوشمار جدید ذرائع‌پیداوار کے سرمایہ‌داری دباؤ کے نیچے دبے ہونے کے باوجود ان کی انتہائی بڑی اور وسیع قوت کا کم و بیش صحیح اندازہ لگانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ مسٹر گفن کے نزدیک برطانیہ‌عظمی اور آئرلینڈ کی کل دولت تخمیناً اتنی تھی:

۱۸۱۴ء میں دو ارب بیس کروڑ پاؤنڈ
۱۸۶۵ء میں چھ ارب دس کروڑ پاؤنڈ
۱۸۷۵ء میں آٹھ ارب پچاس کروڑ پاؤنڈ

اقتصادی بحران کے زمانے میں ذرائع پیداوار اور پیدا شدہ اشیا کے فضول‌خرچی اور بےدردی سے ضائع کرنے کی ایک مثال کے طور پر دوسری جرمن صنعتی کانگرس (برلن، ۲۱ فروری ۱۸۷۸ء) میں بتایا گیاتھا کہ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۸ء تک کے اقتصادی بحران میں محض جرمنی کی لوہے کی صنعت میں ۲ کروڑ ۲۷ لاکھ ۵۰ ہزار پاؤنڈ کا نقصان ہوا۔ (اینگلس کا نوٹ)

واضح اور معین تنظیم نراج اور بدنظمی کی جگہ لےلیتی ہے۔ انفرادی زندگی کےلئے جدوجہد غائب ہوجاتی ہے۔ تب انسان پہلی دفعہ ایک معنی میں ہمیشہ کےلئے باقی حیوانی دنیا سے بالکل الگ اور ممتاز ہوجاتا ہے اور محض حیوانی حالات‌زندگی سے نکل کر واقعی انسانی حالات زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ حالات‌زندگی کا پورا دائرہ جو انسان کے گردوپیش موجود ہوتا ہے اور جو اب تک انسان پر حکومت کرتا آیا تھا، اب انسان کے — جو پہلی دفعہ فطرت کا اصلی اور باشعور فرماں‌روا بنتا ہے — قبضہ قدرت میں آجاتا ہے، کیونکہ اب وہ اپنی سماجی تنظیم کا مالک‌ومختار ہوجاتا ہے۔ انسان کے خود اپنے سماجی عمل کے قوانین جو اب تک اس کے روبرو قوانین‌فطرت کی طرح استادہ تھے، جو انسان کےلئے اجنبی ہوتے ہیں اور اس پر حکومت کرتے ہیں، اب انہیں انسان پورے فہم‌وادراک کے ساتھ استعمال کرےگا اور اسی‌لئے ان پر غالب بھی آجائےگا۔ انسان کی خود اپنی سماجی تنظیم جو اب تک اس کو ایک ناگزیر ضرورت معلوم ہوتی تھی جسے فطرت اور تاریخ نے اس کے اوپر ٹھونس دیا تھا اب خود انسان کے آزادانہ عمل کا نتیجہ بن‌جاتی ہے۔ غیرمتعلق، خارجی قوتیں جنھوں نے اب تک تاریخ پر حکومت کی ہے اب خود انسان کے قبضے اور اختیار میں آجاتی ہیں۔ صرف اسی وقت سے خود انسان زیادہ سے زیادہ شعوری طور پر اپنی تاریخ خود بنائےگا۔ صرف اسی وقت سے انسان کے حرکت میں لائے ہوئے سماجی اسباب سے زیادہ تر اور روزافزوں طور پر وہی نتائج حاصل ہوں‌گے جو انسان چاہتا ہے۔ یوں گویا انسان حلقۂجبر سے بلند ہوکر حلقۂاختیار میں قدم رکھتا ہے۔

آئیے ہم مختصراً اپنے تاریخی ارتقا کے خاکے کا خلاصہ بیان کریں:

۱۔ قرون‌وسطی کا سماج — چھوٹے پیمانے پر انفرادی پیداوار۔ ذرائع پیداوار انفرادی صرف و استعمال کے لئے موزوں اور مناسب اور اسی‌لئے ابتدائی شکل کے، بھدے، بھونڈے اور ادنی درجے کے ہیں اور صرف محدود طور پر کام دے سکتے ہیں۔ پیداوار فوری استعمال کےلئے ہے — یا تو خود پیدا کرنےوالے کے یا اس کے جاگیردار آقا

کے استعمال کےلئے - جہاں کہیں پیداوار اس استعمال کی ضرورت سے زائد ہوجاتی ہے صرف وہیں یہ زائد پیداوار فروخت کےلئے پیش کی جاتی ہے اور تبادلے میں شامل ہو جاتی ہے - لہذا جنس تبادلہ (مال) کی پیداوار ابھی عالم طفلی میں ہے - لیکن وہ اپنے اندر ابھی سے پورے سماج کی پیداوار میں نراج کے بیج لئے ہوئے ہے -

۲ - سرمایہ‌داری انقلاب — صنعت کی کایاپلٹ — شروع میں سادہ امدادباھمی اور کارخانہ‌داری کے ذریعے - اب تک منتشر ذرائع پیداوار کا بڑے بڑے کارخانوں میں مرکوز ہونا - اس کے نتیجے کے طور پر ان ذرائع پیداوار کا انفرادی سے سماجی ذرائع پیداوار میں تبدیل ہونا — ایک ایسی تبدیلی جو مجموعی طور پر تبادلے کی شکل پر اثرانداز نہیں ہوتی - تصرف کی پرانی شکلیں برقرار رہتی ہیں - سرمایہ‌دار نمودار ہوتا ہے - ذرائع پیداوار کے مالک کی حیثیت سے وہ اشیائے پیداوار پر بھی قبضہ کرلیتا ہے اور انھیں جنس تبادلہ میں تبدیل کردیتا ہے - پیداوار اب ایک سماجی عمل ہوگئی ہے - تبادلہ اور تصرف اب تک انفرادی عمل — افراد کا عمل — ہی ہیں - سماجی اشیائے پیداوار پر انفرادی سرمایہ‌دار کا قبضہ اور تصرف ہوتا ہے - یہ بنیادی تضاد ہے جس سے وہ تمام تضاد نکلتے ہیں جن کے اندر ہمارا موجودہ سماج حرکت کرتا ہے اور جنھیں جدید صنعت بےنقاب کرتی ہے -

الف - پیدا کرنےوالے کا ذرائع پیداوار سے بالکل قطع تعلق اور جدائی - مزدور کا زندگی بھر کےلئے اجرتی محنت کرنے پر مجبور ہوجانا - پرولتاری اور بورژوا طبقوں کےدرمیان مخالفت اور کشمکش -

ب - ان قوانین کا روزافزوں غلبہ‌واقتدار اور مسلسل بڑھتا ہوا اثر جو جنس تبادلہ کی پیداوار پر حاوی ہیں - بےلگام مقابلہ - فرداً فرداً ہر فیکٹری کی سماجی تنظیم اور مجموعی طور پر پیداوار کے سماجی نراج کے درمیان تضاد -

ج - ایک طرف تو مشینوں کی ترقی اور تکمیل جسے مقابلے نے ہر کارخانہ‌دار کےلئے لازمی اور جبری بنا دیا ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو مزدوروں کا کام سے اخراج اور صنعتی ریزرو فوج - اور دوسری طرف پیداوار کی بےکراں توسیع ، اسے بھی مقابلے نے ہر کارخانہ‌دار

کےلئے لازمی بنا دیا ہے۔ دونوں طرف پیداواری قوتوں کا غیرمعمولی ارتقا، رسد کا طلب سے زیادہ ہونا، ضرورت سے زیادہ پیداوار، منڈیوں کا مال سے ٹھساٹھس بھرجانا، ہر دس سال کے بعد معاشی بحران، اور ایک دائمی چکر : ادھر ذرائع پیداوار اور اشیائے پیداوار کی افراط — ادھر ایسے مزدوروں کی افراط جن کے پاس نہ روزگار ہے نہ ذرائع زندگی۔ لیکن پیداوار اور سماجی خوش‌حالی کو بڑھانے کے یہ دو وسیلے ایک ساتھ کام کرنے کے ناقابل ہیں کیونکہ پیداوار کی سرمایہ‌داری شکل پیداواری قوتوں کے کام کرنے میں اور اشیائے پیداوار کی گردش میں مانع ہوتی ہے — سوائے اس صورت کے کہ وہ پہلے سرمائے کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہوں۔ اور ان کی حد سے زیادہ افراط ان کے سرمائے میں تبدیل ہونے میں مانع ہے۔ تضاد بڑھ کر حماقت بن گیا ہے: طریق پیداوار تبادلے کی شکل کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ بورژوا طبقے کی اس سے آگے خود اپنی سماجی پیداواری قوتوں کا انتظام کرنے کی نااہلی ثابت ہو جاتی ہے۔

د۔ خود سرمایہ‌داروں کا ایک حد تک پیداواری قوتوں کے سماجی کردار کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جانا۔ پیداوار اور رسل و رسائل کے عظیم اداروں کا پہلے سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں کے، پھر ٹرسٹ کے اور اس کے بعد ریاست کے ہاتھ میں آنا۔ بورژوا طبقے کا ایک فضول اور بےکار طبقہ ثابت ہونا۔ اب بورژوا طبقے کے تمام سماجی کام تنخواہ‌دار ملازمین انجام دیتے ہیں۔

۳۔ پرولتاری انقلاب — تضادوں کا حل ہو جانا: پرولتاری طبقہ پبلک اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور اس کے توسط سے سماجی ذرائع پیداوار کو، جو بورژوا طبقے کے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں، پبلک ملکیت بنا دیتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے پرولتاری طبقہ ذرائع پیداوار کو ان کے سرمائے والے کردار سے نجات دیتا ہے جو اب تک ان کے اوپر نازل تھا، اور ان کے سماجی کردار کو تشکیل و توسیع کی پوری پوری آزادی عطا کرتا ہے۔ اس وقت سے ایک طےشدہ اور معین منصوبے پر مبنی سماجی پیداوار ممکن ہو جاتی ہے۔ پیداوار کا ارتقا اس وقت سے سماج کے مختلف طبقوں کے وجود کو ایک شے متروک بنا دیتا ہے۔ جس تناسب سے سماجی پیداوار کی افراتفری

غائب ہوتی ہے اسی تناسب سے ریاست کا سیاسی اقتدار ختم ہوتا ہے۔ انسان، جو آخرکار خود اپنی سماجی تنظیم کا مالک و مختار ہو جاتا ہے، ساتھ ہی فطرت کا فرماں‌روا، خود اپنا مالک بنتا ہے — اور آزاد ہو جاتا ہے۔

یہ عالمگیر آزادی حاصل کرنے کا کام انجام دینا جدید پرولتاریہ کا تاریخی فریضہ ہے۔ اس کام کی تاریخی شرائط اور اس طرح اس کی پوری فطرت کو بخوبی سمجھ لینا اور پرولتاری طبقے کی طرف، جو اس وقت مظلوم‌ومجبور ہے، اس اہم اور عظیم کام کی شرائط اور معانی کا بھرپور علم منتقل کرنا جو اسے انجام دینا ہے — یہ پرولتاری تحریک کے نظریاتی مظہر، سائنسی سوشلزم، کا فرض ہے۔

اینگلس نے جنوری اور وسط مارچ ۱۸۸۰ء کے درمیان لکھا۔

۱۸۸۰ء میں اس کتاب کا فرانسیسی ترجمہ پیرس میں ایک علیحدہ کتابچے کی شکل میں شائع ہوا۔ ۱۸۸۳ء میں جرمن ترجمہ زورخ میں اور ۱۸۹۱ء میں برلن میں شائع ہوا اور انگریزی ترجمہ لندن میں ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔

۱۸۹۲ء کے مستند انگریزی ایڈیشن کی اصل سے ترجمہ کیا گیا۔

تشریحی نوٹ

۱ - اینگلس کی یہ کتاب ''یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم،، اس کی ایک اور تصنیف ''اینٹی‌ڈیورنگ،، کے ان تین بابوں کا مجموعہ ہے جو خاص کر اس نیت سے ازسر نو لکھے گئے تھے کہ مزدوروں کے سامنے سلیس اور واضح انداز میں مارکس‌ازم کا عالمی نقطۂ‌نظر پیش کر دیا جائے۔ اس کتاب میں اینگلس نے مارکسی نقطۂ‌نظر کے تین اجزائے ترکیبی بیان کئے ہیں۔ یہاں اینگلس نے دکھایا ہے کہ جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کا نظریہ کن راہوں سے گزرکر تیار ہوا اور کارل مارکس نے جو زبردست انکشاف کئے، ایک تو تاریخ کا مادی تصور، اور دوسرے قدرزائد (surplus value) کا نظریہ، محض ان کی بدولت سوشلزم کے خیال کو علمی یا سائنسی بنیاد میسر آئی۔ صفحہ ۵

۲ - ۲۲ مئی سے ۲۷ مئی ۱۸۷۵ء تک کی گوتھا کانگرس میں جرمن مزدور تحریک کے دو الگ الگ رجحان مل کر ایک ہوگئے۔ ایک رجحان کی نمائندگی سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی کرتی تھی (یعنی آئزی‌ناخ‌والے) جس کے رہنما تھے آگسٹ بیبل اور ولہلم لیبکنیخت اور دوسرے میں فرڈیننڈ لاسال کے حامی جنرل جرمن ورکرز یونین‌والے تھے۔ ان دونوں کے متحد ہوجانے پر جرمنی کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی کا نام اختیار کیا گیا اور یوں جرمنی کے مزدور طبقے کے درمیان اختلاف کی دیوار ہٹا

دی گئی۔ گوتھا میں ہونےوالی اس کانگرس کےلئے اتحاد کی خاطر پروگرام کا جو خاکہ پہلے سے شائع کیا گیا تھا، اس پر مارکس اور اینگلس نے کڑی تنقید کی تھی، تاهم تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ اسی کو متحدہ پارٹی کے پروگرام کے طور پر قبول کرلیا گیا۔ صفحہ ٥

٣ - دو دھاتی اصول (Bimetallism) — مالیاتی معاملات میں دو دھاتوں کا سسٹم، جس میں سونے اور چاندی دونوں دھاتوں کو ذریعۂ مبادلہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ صفحہ ٦

٤ - ''فورواڑس،، («Vorwärts») یہ جرمنی کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی کا مرکزی ترجمان تھا جو لائبزگ میں یکم اکتوبر ١٨٧٦ ء سے ٢٧ اکتوبر ١٨٧٨ ء تک نکلتا رہا۔ اینگلس کی مذکورۂ بالا تصنیف ''اینٹی‌ڈیورنگ،، اسی اخبار میں ٣ جنوری ١٨٧٧ ء سے ٧ جولائی ١٨٧٨ ء تک شائع ہوئی۔ صفحہ ٧

٥ - ''مارک،، (The Mark) — جرمنی کی قدیم دیہی برادری۔ اس عنوان کے تحت اینگلس نے ''یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم،، کے پہلے جرمن ایڈیشن کے ایک ضمیمے میں مختصراً جرمن کسانوں کی تاریخ بیان کی ہے جو زمانۂقدیم سے شروع ہوتی ہے۔ صفحہ ٧

٦ - اینگلس نے یہاں روسی عالم سماجیات ایم۔ ایم۔ کوالیفسکی کی تصنیف «Tableau des origines et de l'évolution de la famille et de la proprieté» (''خاندان اور ملکیت کا آغاز اور ارتقا کا ایک خاکہ،،) کی طرف اشارہ کیا ہے جو اسٹاک‌ہوم سے ١٨٩٠ ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ «Primitive Law» جلد اول، «Gens»، شائع شدہ ماسکو ١٨٨٦ ء کا حوالہ ہے۔ صفحہ ٨

٧ - فلسفۂ‌تشکیک (Agnosticism) یونانی لفظ agnostos سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں لاعلمی، یا جسے عربوں نے لادری

کہا۔ یہ ایک عینی نظریہ ہے جس کا کہنا ہے کہ انسانی عقل اس درجہ محدود ہے کہ حواس خمسہ سے ماورا کسی چیز کے علم تک نہیں پہنچتی۔ لاادریت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی : ایک قسم تو ان کی ہے جو موجودات عالم کا مادی موجود تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ ہم ان کی حقیقت کی گہرائی میں اتر سکتے ہیں۔ دوسرے 'لاادریوں' کا کہنا ہے کہ ہم یہ صحیح طور پر جان ہی نہیں سکتے کہ ہمارے احساس کے ماورا عالم کا وجود ہے بھی یا نہیں — اسلئے کائنات کے مادی وجود سے ہم انکار کرتے ہیں۔ صفحہ ۹

۸ - علم کلام (Scholasticism) — قرون وسطی کا وہ مذہبی فلسفہ، جس نے انتہائی مجرد بحثوں اور مفروضوں سے سروکار رکھا اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بالکل بے تعلق رہا۔ اس نام نہاد فلسفے نے منطقی الٹ پھیر سے کام لے کر کلیسائی عقیدوں کو گویا فلسفیانہ بنیاد مہیا کردی۔ صفحہ ۹

۹ - دینیات (Theology) یونانی لفظ کے لفظی معنی ہوں گے خدا سے متعلق علم۔ خود اس لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ دینیات کا نظریہ مذہبی عقیدوں، اخلاقیات اور عبادات کو ایک نظام یا "فلسفیانہ" ربط دینے کی ذہنی کوشش کا نام ہے۔ صفحہ ۹

۱۰ - اسمیت (Nominalism) — قرون وسطی کے فلسفے کا ایک رجحان جو یہ دعوا کرتا تھا کہ عام تصورات الگ الگ اشیا کے نام ہیں۔ حقیقت پرستی کے برخلاف فلسفۂ اسمیت نے اس بات سے انکار کیا کہ عالم موجودات کو اعیان ثابتہ کی ایک پرچھائیں قرار دیا جائے۔ اسمیت کا دعوا تھا کہ شے کا وجود مقدم ہے اور اس کے شعور و فہم کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس طرح اسمیت کے ماننے والوں نے قرون وسطی میں مادیت کے نظریے کے نقش اول کی جھلک دکھائی۔ صفحہ ۹

۱۱ - Homoioneriae — مادے کے وہ چھوٹے سے چھوٹے ذرات یا جزو جن کے تقسیم ہوتے چلےجانے کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ قدیم یونانی طبیعی فلسفی انکساگورس کا خیال تھا کہ ایسے ذرات ہی تمام موجودات کا اصل اصول ہیں اور انھی کے ترکیب پانے سے مختلف اجسام اور اشکال کا ظہور ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۰

۱۲ - یہاں اشارہ ہے فلسفی لاک (J. Locke) کی تصنیف «An Essay concerning Human Understanding» (''علم انسانی پر ایک مقالہ،،) کی طرف۔ اشاعت اول ، لندن ، ۱۶۹۰ ء۔ صفحہ ۱۲

۱۳ - خدا پرستی (Theism) — خدائےواحد ، قادر مطلق و خالق کائنات کا عقیدہ۔ صفحہ ۱۲

۱۴ - محسوسیت (لاطینی لفظ sensualis (احساس) سے مشتق ہے اور Sensualism کا فلسفہ کہلاتا ہے) — مطلب یہ کہ انسانی حواس سے جس چیز کا وجود ظاہر ہو ، اسی کا وجود یقینی ہے ، اور محض انسانی حواس ہی ایک ذریعہ علم‌وجز کا۔ ان سے ماورا کسی اور ذریعہ علم کا وجود نہیں ہے۔ صفحہ ۱۲

۱۵ - فلسفۂ الوہیت (Deism) — مذہبی اور فلسفیانہ عقیدہ، جو خدا کو عالم موجودات کا حقیقی سرچشمہ مانتا ہے لیکن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فطرت اور معاشرے کے معاملات میں وہ دخل دیتا رہتا ہے۔ صفحہ ۱۲

۱۶ - لندن کی صنعتی نمائش عالمی پیمانے پر کاروبار کی پہلی نمائش تھی جو مئی سے اکتوبر ۱۸۵۱ ء تک ہوتی‌رہی۔ صفحہ ۱۳

۱۷ - بپٹسٹ (Baptists) — مسیحی مذہب کا ایک نہایت وسیع فرقہ جو یہ مانتا ہے کہ مذہب اختیار کرنا (بپتسمہ لینا) شعور کی عمر کو پہنچنے کےبعد ہی مناسب ہے۔ یہ فرقہ پرانے عقیدوں کی بہت سی تاویلات اور پیچیدگیوں سے منکر ہے اور

جماعت کے ہر ایک فرد کو اپنی سمجھ کے مطابق مقدس کتابوں کا مطلب نکالنے کا حق دیتا ہے۔ بپٹسٹ فرقے نے ۱۷ ویں صدی کے آغاز میں انگلینڈ اور امریکہ میں اپنے جماعت‌خانے قائم کئے۔

نجات فوج (Salvation Army) — ایک رجعت پرست مذہبی خیراتی تنظیم جو ۱۸۶۵ ء میں انگلینڈ میں قائم ہوئی تھی، ۱۸۸۰ ء میں اس کی ازسرنو تنظیم فوجی انداز پر ہوئی (اسی‌لئے آرمی نام پڑا)۔ بورژوازی نے اس جماعت کا ہاتھ بٹایا اور انگلینڈ کے باہر بہت سے ملکوں میں اس جماعت کا جال پھیل گیا جو خیراتی کاموں میں شرکت کرکے، فلاح‌وبہبود کے ادارے قائم کرکے محنت‌کشوں کی توجہ سرمایہ‌داروں کی لوٹ کی طرف سے ہٹانے کی خدمت انجام دیتی ہے۔ صفحہ ۱۴

۱۸ - روحانیت (Spiritualism) لاطینی لفظ spiritus سے مشتق ہے۔ روحانیت‌پرستوں کا خیال ہے کہ روح کا وجود جسم پر منحصر نہیں اور روح عالم موجودات میں مقدم اور ماورا ہے۔ صفحہ ۱۸

۱۹ - فرقہ‌بندی یہاں یونانی لفظ Schism سے مشتق ہے یعنی رفض یا اختلاف۔ قرون‌وسطی میں مسیحی مذہب میں جو اختلافی عقیدے نکلے ان کے‌لئے عام طور سے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۹

۲۰ - ”شاندار انقلاب“ سے مراد انگلستان میں ۱۶۸۸ ء کا انقلاب۔ انگریز بورژوا مورخین اسے یہی نام دیتے ہیں۔ حکومت کا تختہ الٹ‌کر جیمس دوم کو برطرف اور اسٹوارٹ شاہی خاندان کو بےدخل کیا گیا۔ اسی انقلاب نے آئینی بادشاہت قائم کی (۱۶۸۹ ء)۔ ولیم آف اورینج کو تخت‌وتاج ملا۔ یہ ایک طرح کا سمجھوتہ تھا جاگیردار اشرافیہ اور بڑی بورژوازی کے درمیان۔ صفحہ ۲۳

۲۱ - سفیدوسرخ گلاب کی جنگیں — ۱۴۵۵ ء سے ۱۴۸۵ ء تک انگلینڈ میں یارک اور لنکاسٹر شاہی خاندانوں کی جنگیں۔ ایک

فریق کے پرچم پر سفید گلاب تھا ، دوسرے کے پرچم پر سرخ - یارک‌والوں کے طرفدار زیادہ ترقی یافتہ جنوبی حصہ ملک کے بڑے بڑے جاگیردار ، سردار اور شہری لوگ تھے ، لنکاسٹر کی پشت پر شمالی حصہ ملک کے اوپر کے شرفا تھے - ان مسلسل جنگوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرانے وقتوں کے صاحب جائداد خاندانوں کا بالکل صفایا ہوگیا اور تھیوڈروں کا ایک نیا خاندان ابھرا جس نے تاج وتخت پر قبضہ کرکے ملک میں مطلق العنان بادشاہی قائم کردی - صفحہ ۲۳

۲۲ - کارٹیزینزم (Cartesianism) — سترھویں صدی کے فرانسیسی فلسفی دیکارت کے خیالات - ان خیالات کے پیرو مادی نتائج نکالتے ہیں - صفحہ ۲۵

۲۳ - ’’ حقوق انسانی کا اعلان نامہ ،، — فرانس کی آئین‌ساز اسمبلی نے اسے ۱۷۸۹ ء میں منظور کیا تھا اور نئے بورژوا نظام کے سیاسی اصولوں کے پیش‌نظر تیار کیا گیا تھا جسے انقلاب کے زمانے میں (۱۷۹۱ ء) فرانسیسی آئین میں شامل کر لیا گیا - اسی کی بنیاد پر جیکوبیوں نے ۱۷۹۳ ء میں اپنا ’’ حقوق انسانی کا اعلان نامہ ،، تیار کیا - بعد میں نیشنل کنوینشن نے اسے فرانسیسی ریپبلک کے پہلے آئین کا بنیادی جز بنالیا - صفحہ ۲۶

۲۴ - یہاں اور آگے چل کر بھی اینگلس نے ضابطہ نپولین (Code Napoleon) کے جو حوالے دئے ہیں ان کا مقصد صرف ۱۸۰۴ ء کے ضابطہ شہری (Code Civil) کی طرف نہیں بلکہ بورژوا قانونوں کے پورے نظام کی طرف اشارہ کرنا ہے - یہ پانچ ضابطے تھے : ضابطہ شہری ، دیوانی ، کاروباری ، فوجداری اور جرائم ، جو نپولین بوناپارٹ کے زمانے ۱۸۱۰ ء — ۱۸۰۴ ء میں نافذ کئے گئے تھے - نپولین نے جرمنی کے جن مغربی اور جنوب مغربی حصوں پر قبضہ کیا تھا وہاں بھی انہی پر عملدرامد ہوتا تھا - بعد میں ۱۸۱۵ ء میں جب یہ علاقہ پروشیا میں ملا لیا

گیا تب بھی کچھ عرصے تک ان ضابطوں کا عمل دخل باقی رہا۔ صفحہ ۲۶

۲۵ - دھشت گردی — انقلابی جمہوری ڈکٹیٹری کا زمانہ، جون ۱۷۹۳ء سے جولائی ۱۷۹۴ء تک کے انقلابی دور میں جیکوبی اقتدار کی بدولت اس دور کو دھشت کا دوردورہ کہا جاتا ہے۔ صفحہ ۲۸

۲۶ - یہاں اشارہ ہے انگلستان میں اس تحریک کی طرف جو انتخابی حقوق کی اصلاح کےلئے چل رہی تھی۔ رائے عامہ کے دباؤ سے بالآخر دارالعوام نے ۱۸۳۱ء میں قانون پاس کردیا اور ۱۸۳۲ء میں دارالامرا نے اس کی منظوری دےدی۔ اصلاح کا مقصد تھا صاحب جائداد اور نقد رقم‌والوں کی سیاسی اجارہ‌داری توڑنا اور اصلاح کا قانون منظور ہونے سے پارلیمنٹ کے دروازے صنعتی بورژوازی پر کھل گئے۔ پرولتاریہ اور چھوٹی بورژوازی، جنھوں نے اصلاح کےلئے خاص کر زور لگایا تھا، لبرل بورژوازی نے انھیں فریب دےدیا اور وھی دونوں انتخابی حقوق سے محروم رہ گئے۔ صفحہ ۲۹

۲۷ - ۱۸۲۴ء میں رائےعامہ کے دباؤ سے انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا اور ٹریڈیونینوں پر پابندی منسوخ کردی گئی۔ صفحہ ۳۰

۲۸ - عوامی چارٹر (People's Charter) جس میں چارٹسٹوں کے مطالبے شامل تھے (چارٹزم کی تشریح ملاحظہ ھو نوٹ نمبر ۳۰ میں) ۸ مئی ۱۸۳۸ء کو ایک مسودہ قانون کی صورت میں شائع ھوا تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے بحث کےلئے رکھا جائے۔ مسودے میں چھہ دفعات تھیں: عام حق رائے دھندگی (۲۱ سال سے اوپر کے مرد باشندوں کےلئے)، پارلیمنٹ کے سالانہ انتخابات، پوشیدہ رائےدھندگی، مساوی حلقے، پارلیمنٹ کی ممبری کےلئے صاحب جائداد ھونے کی شرط کا خاتمہ، اور پارلیمنٹ کے ممبروں

کے لئے مقررہ تنخواہ۔ چارٹسٹوں نے پارلیمنٹ سے چارٹر منظور کرنے کی تین بار درخواستیں کیں لیکن ۱۸۳۹ء، ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۹ء میں وہ برابر نامنظور کردی گئیں۔ صفحہ ۳۰

۲۹ - اناج کے قوانین کی مخالف لیگ برطانوی صنعتی بورژوازی کی تنظیم تھی جو ۱۸۳۸ء میں مانچسٹر کے مال مالکوں کوبڈین اور برائٹ نے بنائی تھی۔ لیگ کا مطالبہ تھا کہ تجارت کی پوری آزادی ہو۔ اس نے اناج کی درآمد پر سے ہر قسم کی پابندی اٹھوانے کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کی اجرت گھٹائی جائے اور صاحب جائداد اشرافیہ کا معاشی اور سیاسی اقتدار کمزور ہو۔ ۱۸۴۶ء میں جب اناج پر پابندی کے قانون منسوخ ہوئے تو لیگ کا وجود بھی ختم ہوگیا۔ صفحہ ۳۰

۳۰ - چارٹزم (Chartism) انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی مزدوروں کی ایک سیاسی تحریک جو معاشی زیادتیوں اور سیاسی دھاندلیوں کے خلاف ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۵ء کے درمیان چلتی رہی۔ تحریک کی اصل مانگ یہ تھی کہ عوامی حقوق تسلیم کئے جائیں جن میں سب کے لئے حق رائے دھندگی اور مزدوروں کے لئے اس حق کی کئی ضمانتیں شامل تھیں۔ لینن کے بقول چارٹزم "پہلی وسیع اور صحیح معنی میں عوامی، سیاسی صورت میں پرولتاریہ کی انقلابی تحریک تھی"۔ صفحہ ۳۰

۳۱ - چارٹسٹوں نے ۱۰ اپریل ۱۸۴۸ء کو لندن میں ایک مظاہرے کا انتظام کیا تھا تاکہ جلوس کی شکل میں جاکر پارلیمنٹ کو اپنے مطالبوں کی یادداشت پیش کریں۔ انتظام کرنے والوں کی ھچکچاھٹ اور تذبذب نے جلوس میں کھنڈت ڈال دی جس کی وجہ سے رجعت پرستوں کی ھمت بڑھ گئی اور انھوں نے مزدوروں اور چارٹسٹوں کے ساتھ سختی برتی۔ صفحہ ۳۰

۳۲ - ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو فرانس میں انقلاب کے مخالف لوئی بوناپارٹ نے حکومت کا تختہ الٹ کر دوسری شہنشاھیت قائم کردی۔

اس پر مارکس کا تفصیلی مضمون ملاحظہ ہو۔ مارکس اور اینگلس کی منتخب تصانیف، حصۂدوم میں۔ صفحہ ۳۰

۳۳ - ''برادر جوناتھن،، — ریاستہائے متحدہ امریکہ کو جس طرح اب ''چاچا سام،، کہا جاتا ہے اسی طرح پہلے اس کے لئے یہ نام تھا۔
احیائے مذہب (Revivalism) — اٹھارویں صدی کی ایک تحریک جس نے مذہب کے گھٹتے ہوئے زور کے احیا کی کوشش کی۔ دو امریکی پرچارک موڈی اور سانکی اس کے منظم کرنے والے تھے۔ صفحہ ۳۰

۳۴ - ۱۸٦۷ء کے انگلینڈ میں عام مزدور تحریک کے دباؤ سے دوسری پارلیمنٹری اصلاح ہوئی۔ پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اصلاح کا حاصل یہ ہوا کہ رائے دھندوں کی تعداد پہلے سے دوگنی ہوگئی۔ تعلیم یافتہ مزدوروں کے ایک حصے کو بھی رائے دینے کا حق مل گیا۔ صفحہ ۳۳

۳۵ - وھگ (Whigs) انگلینڈ کی مشہور سیاسی پارٹی جس کی بنیاد ۱٦۸۰ء کے عشرے میں رکھی گئی تھی۔ جو جاگیردار طبقہ سرمایہداری کی طرف آچلا تھا، اس کے مفاد، تجارتی کاروباری حلقے کے مفاد اور ساھوکاروں کے حقوق کی حمایت میں یہ پارٹی بادشاھی اختیارات کو محدود کرنے کی حامی تھی۔ ۱۹ ویں صدی کے وسط تک یہ پارٹی کام کرتی رہی، پھر بورژوازی کے دوسرے سیاسی گروھوں سے مل ملا کر برطانیہ کی لبرل پارٹی میں مدغم ھوگئی۔ صفحہ ۳۴

۳٦ - ٹوری (Tory) یہ وھگ کے مقابل کی سیاسی پارٹی تھی جو سترھویں صدی کے آخر میں بنی۔ یہ پارٹی صاحب جائداد طبقے، اوپر کے کلیسائی عہدہ داروں کی نمائندہ تھی جو

جاگیردارانہ ماضی اور انگلستان کے پرانے چلن کی حامی تھی - ۱۹ ویں صدی کے وسط میں اس پارٹی کی بنیاد پر قداست پسند (Conservative) پارٹی بن گئی جو آج بھی موجود ہے - صفحہ ۳۴

۳۷ - بورژوا نظریات کے ایک مدرسۂ فکر کے حامی جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں جرمنی میں نمودار ہوا تھا - کتھیڈر سوشلسٹوں میں سے زیادہ‌تر پروفیسر تھے - وہ لوگ یونیورسٹی کے منبروں سے مارکس‌واد کی مخالفت کرتے تھے (اور اسی لئے ان کا نام کتھیڈر سوشلسٹ پڑا - کتھیڈر کے معنی ھیں منبر) - ان لوگوں کا دعوی تھا کہ بورژوا ریاست چند اصلاحات کے ذریعے طبقات کی آویزش ختم کر سکتی ھے اور سوشلزم کی بنیاد رکھ سکتی ھے - ان لوگوں کے پروگرام میں یہ شامل تھا کہ بیماری اور حادثے سے مزدوروں کا بیمہ لازمی اور فیکٹری قانون میں کچھ خاص گنجائشوں کا اضافہ ھونا چاھئے - ان حضرات کی رائے میں اچھی طرح منظم ٹریڈ یونینیں ھوں تو پھر سیاسی تحریک اور مزدور طبقے کی سیاسی پارٹی کی ضرورت نہیں رھتی - کتھیڈر سوشلزم ترمیم‌پسندی کا ایک سرچشمہ ثابت ھوا - صفحہ ۳۵

۳۸ - رسوم پرستی (Ritualism) — چرچ آف انگلینڈ کی ایک شاخ جو ۱۸۳۰ ء کے عشرے میں پھوٹی - یہ لوگ پرانے کیتھولک عقیدے اور اس کے رسوم کو جوں کا توں رائج کرنے کے حق میں تھے - اسی‌لئے یہ نام پڑ گیا - صفحہ ۳۵

۳۹ - لندن کے مشرقی حصے کی طرف اشارہ ھے جس میں پرولتاریوں اور غریبوں کے محلے تھے - صفحہ ۳۷

۴۰ - یہ خیال کہ زیادہ ترقی‌یافتہ سرمایہ‌دار ملکوں میں بیک‌وقت پرولتاری انقلابوں کا سلسلہ چلنے کا تو امکان ھے ، البتہ یہ ممکن نہیں کہ پرولتاری انقلاب کسی ایک ملک میں آ کر رہ جائے ، اینگلس نے ۱۸۴۷ ء میں قائم کیا تھا اور اس کی تصنیف

” کمیونزم کے اصول ،، میں بیان ہوا ہے ۔ اجارہ دارانہ سرمایہ‌داری سے پہلے کے دور میں یہ قیاس درست تھا لیکن جب تاریخی حالات بدل گئے اور سرمایہ‌داری نے اجارہ داری میں قدم رکھدیا تو لینن نے اپنے دریافت کئے ہوئے اس اصول پر کہ سامراجی دور میں سرمایہ‌داری کا معاشی اور سیاسی اٹھان ناہموار ہوتا ہے ، یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اشتراکی انقلاب بیک‌وقت کئی ملکوں میں یا کسی ایک ملک میں کامیاب ہوسکتا ہے ، البتہ یہ ممکن نہیں کہ اشتراکی انقلاب بیک‌وقت سب ملکوں میں یا بہت سارے ملکوں میں پروان چڑھے ۔ یہ نتیجہ سب سے پہلے لینن نے اپنے اس مضمون میں واضح کیا ہے جو ۱۹۱۵ ء میں لکھا گیا تھا ” یورپ کی ریاستہائے متحدہ کا نعرہ ،، ۔ صفحہ ۳۸

۴۱ - <u>سوشلسٹ دشمن ہنگامی قانون</u> (The Anti — Socialist Law) جرمنی میں ۲۱ اکتوبر ۱۸۷۸ ء کو بنا تھا ۔ اس کے مطابق سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی تمام شاخیں ، عام مزدور انجمنیں ، مزدوروں کے اخبارات وغیرہ خلاف قانون قرار دئے گئے ۔ اشتراکی خیال کی کتابوں رسالوں کو بحق سرکار ضبط کر لینے کا حکم ہوا اور سوشل ڈیموکریٹوں پر زیادتیاں کی گئیں ۔ عام مزدور تحریک کے دباؤ سے یہ قانون پہلی اکتوبر ۱۸۹۰ ء کو منسوخ کر دیا گیا ۔ صفحہ ۴۰

۴۲ - روسو کی شہرۂ آفاق تصنیف ” معاہدۂ عمرانی ،، میں یہ نظریہ بیان ہوا ہے کہ ابتدائی سماج میں انسان قدرتی حالات میں مساوی حقوق کےساتھ بسر کیا کرتے تھے ۔ ذاتی ملکیت چل پڑنے اور مادی نابرابری بڑھ جانے کی وجہ سے لوگ قدرتی کے بجائے شہری حالات میں بسر کرنے لگے اور ریاست قائم ہوئی جو ایک سماجی معاہدے پر مبنی تھی ۔ لیکن جب آگے چل کر سیاسی نابرابری عام ہوتی گئی تو سماجی معاہدہ ٹوٹ گیا اور ایسا طبقہ ابھرا جسے پورے حقوق حاصل نہ تھے ۔ یہ جو حالت اب ہوگئی ہے ، اس سے تبھی نجات پائی جا سکتی ہے کہ

بقول روسو کے ، ایک معقول اسٹیٹ قائم ہو جس میں نئے سماجی معاھدے طے پائیں۔ صفحہ ۳۱

۴۳ - اناببٹسٹ (Anabaptists) — ان کا کہنا تھا کہ بپتسمہ شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد پھر سے ہونا چاھئے۔ صفحہ ۴۲

۴۴ - یہاں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو سترھویں صدی میں انگریزی بورژوا انقلاب میں شہری اور دیہاتی مفلسوں کے حق کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ "اصلی ہموار کرنےوالے" (true levellers) یا "کھودنےوالے" (diggers) کہلاتے تھے۔ یہ لوگ زمین کی ذاتی ملکیت کے خلاف تھے اور قدیم زمانے کی قسم کے یکساں کمیونزم کے حامی تھے۔ ان کی جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ پنچائتی کاشتکاری کے ذریعے سب کی مشترکہ زمین کا نظام قائم ہو جائے۔ صفحہ ۴۲

۴۵ - اینگلس کا اشارہ ہے یوٹوپیائی کمیونزم کے ممتاز نمائندوں کی تحریروں کی طرف : تھامس مور کی کتاب «Utopia» اور تھامس کمپانیلا کی کتاب «City of the Sun» - صفحہ ۴۲

۴۶ - مجلس نظما (Directorate) — انقلاب فرانس کے زمانے ۹۹—۱۷۹۵ء میں اعلا انتظامیہ ادارہ جس میں پانچ ڈائرکٹر ہوتے تھے اور ہر سال کسی ایک کی جگہ دوسرے کو چنا جاتا تھا۔ اس ادارے نے بڑی بورژوازی کے مفاد کی تائید کی اور جمہوری طاقتوں پر مسلط کر دی - صفحہ ۴۴

۴۷ - اشارہ ہے فرانس کے بورژوا انقلاب (۱۸ویں صدی کے آخری سال) کی طرف جس کا نعرہ تھا "آزادی ، مساوات ، اخوت"۔ صفحہ ۴۴

۴۸ - نیولانارک (New Lanark) — اسکاٹلینڈ کے شہر لانارک کے نزدیک روئی کاتنے کا کارخانہ جو ۱۷۸۴ء میں مزدوروں کی بستی کے ساتھ ساتھ بنایا گیا۔ صفحہ ۴۵

۴۹ - تیسرا طبقہ — جاگیرداری فرانس کے زمانے میں ان کم حیثیت لوگوں کو کہتے تھے جو ٹیکس ادا کرتے ہوں : کسان ، بیوپاری ، دستکار ، بعد میں بورژوازی کا بھی اسی میں شمار ہوا - انقلاب فرانس کے شروع ہوتے وقت اس اصطلاح کی بڑی اہمیت ہوگئی کیونکہ بورژوازی نے عام لوگوں کو اس پر آمادہ کر کے اپنی طرف ملا لیا کہ اب تک دو طبقے ہوئے ہیں ، جاگیرداروں کا اور کلیسائی پیشواؤں کا - لیکن اب ان کے برخلاف تیسرا طبقہ بنائیں گے - صفحہ ۴۷

۵۰ - سو دن — جب نپولین بوناپارٹ جزیرہ ایلب میں جلاوطنی سے فرار کر کے اچانک پیرس آپہنچا تو ۲۰ مارچ ۱۸۱۵ ء سے ۲۲ جون ۱۸۱۵ ء کا زمانہ اس کی عارضی حکومت کے سو دن کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے - پھر اسے آخری دست برداری پر مجبور ہونا پڑا - صفحہ ۴۹

۵۱ - واٹرلو (بلجیم) کی جنگ انگریزی محاورے میں آخری شکست کے ہم معنی ہے - اینگلو ڈچ فوجوں نے ویلنگٹن کی کمان میں اور پروشیائی فوج نے بلوخر کی کمان میں ۱۸ جون ۱۸۱۵ ء کو نپولین کو آخری شکست دی اور ۳ دن بعد اس کی دست برداری لکھوالی - صفحہ ۴۹

۵۲ - اکتوبر ۱۸۳۳ ء میں لندن میں رابرٹ اووین کے زیر صدارت کوآپریٹیو سوسائٹیوں اور ٹریڈیونینوں کی ایک بڑی کانگرس منعقد ہوئی جس میں «The great national consolidated Trade Union of G. B. & Jreland» قائم ہوگئی - سرمایہ‌دارانہ ریاست اور بورژوا سماج کی شدید مخالفت نے سال بھر بعد اگست ۱۸۳۴ ء میں یونین تڑوا دی - صفحہ ۵۶

۵۳ - اینگلس کی مراد ہے یہاں ان بازاروں سے (انھیں بازار ہی کہتے تھے) جو رابرٹ اووین کی حامی مزدور کوآپرٹیو سوسائٹیوں نے انگلینڈ کے مختلف شہروں میں قائم کئے تھے اور جہاں

محنت کی پیداوار کا منصفانہ تبادلہ کیا جاتا تھا۔ محنت کے ان بازاروں میں سکہ نہیں، محنت کے فی یونٹ حساب سے نوٹ چلا کرتے تھے اور نوٹوں کی ویلیو محنت کے گھنٹوں کے حساب سے مقرر تھی۔ تھوڑے دنوں چل کر یہ بازار ٹھپ ہوگئے۔ صفحہ ۵۶

۵۴۔ پرودھوں فلسفی کی کوشش سے ۱۸۴۸ — ۴۹ ء کے انقلاب کے زمانے میں ایک عوامی بینک فرانس میں قائم ہوا تھا تاکہ سکہ استعمال کئے بغیر تھوڑا بہت مال تیار کرنے والے اس بینک کے ذریعے اپنے مالوں کا تبادلہ کرسکیں اور مزدوروں کو وہاں سے مفت قرضہ ملا کرے۔ ابھی بینک کھلے ہوئے (۳۱ جنوری ۱۸۴۹ ء) دو مہینے گزرے ہوں گے کہ فیل ہوگیا اور اپریل کے شروع میں بند کردیا گیا۔ صفحہ ۵۶

۵۵۔ سائنس کے ارتقا کا عہد سکندری تیسری صدی قبل مسیح سے ساتویں صدی عیسوی تک کا زمانہ تھا۔ اس کا نام مصر کے شہر سکندریہ سے لیا گیا ہے جو اس زمانے میں بین‌اقوامی معاشی تعلقات اور بیوہار کے اہم‌ترین مرکزوں میں سے تھا۔ عہد سکندری میں ریاضی (اقلیدس اور آرشیمیدس)، جغرافیہ، علم ہیئت، علم تشریح بدن اور علم الاعضا وغیرہ میں بہت ترقی ہوئی۔ صفحہ ۵۹

۵۶۔ ان میں سب سے زیادہ اہم دریافتیں یہ ہیں: ۱۴۹۲ ء میں کولمبس کا امریکہ دریافت کرنا، اور ۱۴۹۸ ء میں پرتگال کے باشندے واسکودی گاما کا ہندستان تک پہنچنے کا سمندری راستہ دریافت کرنا۔ صفحہ ۷۸

۵۷۔ یہاں ان جنگوں کی طرف اشارہ ہے جو ۱۷ ویں صدی کے دوسرے نصف اور ۱۸ ویں صدی کے شروع میں چلتی رہیں۔ فرانس کی رہنمائی میں یورپی طاقتوں کی مخلوط طاقت (Coalition) ایک فریق تھی اور پہلے ہالینڈ، پھر انگلینڈ کی رہنمائی میں ان

طاقتوں کا کولیشن دوسرا فریق۔ ان مسلسل جنگوں کی تہہ میں خاص کر فرانس کے اشرافیہ اور بورژوازی کی یہ نیت کارفرما تھی کہ کسی صورت اپنی ملکی سرحدوں سے باہر اقتدار قائم کریں اور یورپ میں سیاسی اور اقتصادی غلبہ حاصل ہوجائے۔ اول تو ان جنگوں نے اور پھر اسپین میں تاج و تخت کی وراثت والی جنگ نے (جو ۱۷۰۱ء سے ۱۷۱۴ء تک چلی اور ان تجارتی جنگوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھی) فرانس کی کمر توڑ دی، اقتصادی اور فوجی میدان میں وہ اپنی ساکھ کھو بیٹھا اور وسیع مقبوضہ علاقوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ صفحہ ۷۸

۵۸ - بحری تجارت (Seehandlung) کے نام سے پروشیا میں ۱۷۷۲ء میں ایک شاہی بحری تجارت کمپنی قائم کی گئی تھی۔ اسے خاص قسم کے حقوق حکومت کی طرف سے حاصل تھے اور اس نے پروشیائی حکومت کو جی کھول کر قرضے دئے۔ صفحہ ۸۶

ناموں کا اشاریہ

— ا —

ارسطو (Aristotle) (۳۸۴ — ۳۲۲ قبل مسیح) — قدیم یونانی فلسفی۔ فلسفے میں مادیت پسندی اور عینیت پرستی کے درمیان ڈانواں ڈول ہورہا تھا۔ غلام مالکوں کے طبقے کا نظریہ ساز تھا۔ صفحہ ۵۷

آرک رائٹ (Arkwright)، رچرڈ (۱۷۳۲ء — ۱۷۹۲ء) — کاتنے کی مشین کا موجد۔ صفحہ ۲۸

اسپینوزا (Spinoza) ، باروخ بینے دکٹ (۱۶۳۲ء — ۱۶۷۷ء) — ہالینڈ کا شہرۂ آفاق مادیت پسند فلسفی ، دہریہ۔ صفحہ ۵۸

اسٹوارٹ (Stuarts) ، خاندان شاہی — (۱۳۷۱ء سے) اسکاٹ اور بعد میں (۱۶۰۳ء سے ۱۷۱۴ء تک) انگریز۔ صفحہ ۲۵

انکسا گورس (Anaxagoras)، (۵۰۰ — ۴۲۸ قبل مسیح) — قدیم یونانی مادیت پسند فلسفی۔ صفحات ۱۰، ۴۰

اووین (Owen) ، رابرٹ (۱۷۷۱ء سے ۱۸۵۸ء) — یوٹوپیائی (قیاسی) سوشلزم کی مشہور انگریز شخصیت۔ صفحات ۱۳، ۴۲، ۴۵، ۵۵ — ۵۲

— ب —

بابیوف (Babeuf)، گراخ (اصل نام فرانسوا نوئل) (۱۷۶۰ء سے ۱۷۹۷ء) — فرانسیسی انقلابی جو یوٹوپیائی (قیاسی) مکمل

مساوات والے کمیونزم کا خاص ترجمان تھا ، وھی '' مساواتیوں ،،
کی سازش کا سرغنہ تھا ۔ صفحہ ۳۲

برائٹ (Bright) ، جان (۱۸۸۹ ء — ۱۸۱۱ ء) — انگریز مل مالک ، آزاد تجارت کا حامی ۔ اناج کے قانونوں کی مخالف لیگ بنوانےوالا ۔ ۱۸٦۰ ء کے بعد سے وہ لبرل پارٹی کا ایک لیڈر رھا اور لبرل حکومتوں میں وزارت کے عہدے سنبھالے ۔ صفحہ ۳۳

برنتانو (Brentano) ، لویو (۱۹۳۱ ء — ۱۸۴۴ ء) — جرمن بورژوا ماھرمعاشیات ، مارکس‌ازم کا دشمن ۔ صفحہ ۳۷

بسمارک (Bismarck) ، اوٹو (۱۸۱۵ ء سے ۱۸۹۸ ء) — جرمن پرنس ۔ ریاستی معاملات میں نمایاں ، پروشیا اور جرمنی کی طرف سے غیرملکی تعلقات میں سرگرم ۔ پروشیا کے تعلقہ‌داروں کا نمائندہ جو وھاں ۱۸٦۲ ء سے ۱۸۷۱ ء تک منسٹر پریسیڈنٹ تھا ۔ بعد میں ۱۸۷۱ ء سے ۱۸۹۰ ء تک جرمن سلطنت کا ریخ چانسلر (صدر) رھا ۔ صفحہ ۸۵

بک‌لینڈ (Buckland) ، ولیم (۱۸۵٦ ء — ۱۷۸۴ ء) — انگریز ماھرعلم الارض اور پادری ۔ صفحہ ۱۳

بولنگ‌بروک (Bolingbroke) ، ھنری (۱۷۵۱ ء — ۱٦۷۸ ء) — انگریز سیاست‌داں ، ٹوریوں کی پارٹی کا ایک لیڈر ، فلسفۂ الوھیت کا نمائندہ ۔ صفحہ ۲۵

بیکن (Bacon) ، فرانسس (۱٦۲٦ ء — ۱۵٦۱ ء) — انگریز مادیت پسند فلسفی ، سیاست‌داں اور مؤرخ ۔ صفحات ۱۲ — ۹ ، ۵۹

بیمے (Böhme) ، یاکب (۱٦۲۴ ء — ۱۵۷۵ ء) — جرمن دستکار ، صوفی فلسفی ۔ صفحہ ۱۰

— پ —

پرودھوں (Proudhon) ، پیٹر ژوزف (۱۸۰۹ ء سے ۱۸٦۵ ء) — مشہور فرانسیسی ماھر معاشیات وعمرانیات ، چھوٹی بورژوازی کا نظریہ‌ساز ۔

انارکزم یا نراج کا نظریہ تیار کرنےوالوں میں وہ بھی تھا۔
صفحہ ۵۶

پریسٹلی (Priestley)، جوزف (۱۷۳۳ء — ۱۸۰۴ء) — انگریز کیمیاداں، مادیت‌پسند فلسفی اور ترقی‌پسند سماجی کارکن۔
صفحہ ۱۲

— چ —

چارلس اول (Charles I)، (۱۶۰۰ء — ۱۶۴۹ء) — انگلستان کا بادشاہ (۱۶۲۵ء — ۱۶۴۹ء)، سترھویں صدی کے انگریز بورژوا انقلاب کے زمانے میں اس کو سر کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ صفحہ ۲۲

— د —

دیدیرو (Diderot)، (۱۷۱۳ء — ۱۷۸۴ء) — فرانسیسی مادیت پسند فلسفی، اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی انقلابی بورژوا طبقے کا نظریہ‌ساز۔ صفحہ ۵۸

دیکارت (Descartes)، رینے (۱۵۹۶ء — ۱۶۵۰ء) فرانس کا ثنویت پسند (dualist) فلسفی، ماہر علم ریاضی‌وطبیعیات۔ صفحہ ۵۸

دیمو کریتس (Democritius) (۴۶۰ ؟ — ۳۷۰ قبل مسیح) — قدیم یونانی مادیت پسند فلسفی، نظریۂ سالمات (atomic theory) کے بانیوں میں سے ایک۔ صفحہ ۱۰

— ڈ —

ڈارون (Darwin)، چارلس (۱۸۰۹ء — ۱۸۸۲ء) — عظیم انگریز ماہر علم فطرت، نامیاتی ارتقا کے نظرئے کا بانی۔ صفحات ۶، ۶۲، ۷۸

ڈزرئیلی (Disraeli)، بنجامن، لارڈ بیکنس‌فیلڈ (۱۸۰۴ء — ۱۸۸۱ء) — انگریز سیاست‌داں اور ادیب، قدامت پرست، ۱۸۶۸ء میں

اور ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۰ء تک انگلستان کا وزیراعظم۔ صفحہ ۳۴

ڈنس (Duns) ، اسکاٹس یوحانس (تقریباً ۱۳۰۸ء — ۱۲۶۵ء) — قرون‌وسطی کا ماہر علم کلام ، فلسفۂ اسمیت کا ایک نمائندہ جو اس زمانے میں مادیت‌پسندی کی پہلی شکل تھی۔ ''آکسفورڈ تصنیف،، نامی کتاب کا لکھنے والا۔ صفحہ ۹

ڈوڈویل (Dodwell) ، ہنری (تاریخ وفات ۱۷۸۴ء) — انگریز مادیت‌پسند فلسفی۔ صفحہ ۱۲

ڈیورنگ (Dühring) ، یوگینی کارل (۱۸۳۳ء سے ۱۹۲۱ء) — جرمن فلسفی (Eclectic philosopher) اور گھٹیا قسم کی معاشیات کا ماہر ، چھوٹی بورژوازی کے رجعت پرستانہ سوشلزم کا ترجمان۔ اس کے فلسفے میں آئڈیلزم بھی ہے اور گھٹیامادیت پسندی بھی ، پوزیٹوزم (مثبتیت) بھی ہے اور مابعد الطبیعیات بھی۔ صفحات ۷ — ۵

— ر —

روسو (Rousseau) ، ژاں ژاک (۱۷۷۸ء — ۱۷۱۲ء) — فرانس کا مشہور روشن‌خیال ، جمہوریت‌پسند ، فلسفی ، انقلابی چھوٹی بورژوازی کا نظریہ‌ساز۔ صفحات ۳۱ ، ۴۳ ، ۵۸

— ز —

زی کنگین (Sickingen) ، فرانز (۱۵۲۳ء — ۱۴۸۱ء) — جرمن نائٹ (knight) — ۱۵۲۲ء میں نچلے طبقۂ اشرافیہ کی بڑے بڑے شاہزادوں کے خلاف بغاوت کا رہنما۔ صفحہ ۲۱

— س —

سانکی (Sankey) ، ایرا ڈیوڈ (۱۹۰۸ء — ۱۸۴۰ء) — امریکی مبلغ انجیل اور موڈی کا رفیق‌کار ، احیائے مذہب کی تحریک کا ایک بانی۔ صفحہ ۳۰

سین‌سائمون (Saint-Simon) ، آنری (۱۷٦۰ ء سے ۱۸۲۵ ء) — یوٹوپیائی (قیاسی) سوشلزم کی زبردست فرانسیسی شخصیت۔ صفحات ۴۲ ، ۴۵ ، ۴۷ ، ۴۸ ، ٦۳

— ش —

شافٹسبیری، انٹونی (Shaftesbury) (۱۶۷۱ ء — ۱۷۱۳ ء) انگریز فلسفی ، الوہیت‌پرست۔ صفحہ ۲۵

— ف —

فارسٹر (Forster) ، ولیم ایڈورڈ (۱۸۱۸ ء — ۱۸۸٦ ء) — انگریز کارخانہ‌دار ، پارلیمنٹ کا لبرل ممبر رہا۔ آئرلینڈ کے اسور کا وزیر ہوتے ہوئے (۱۸۸۰ — ۸۲ ء) وہ قومی آزادی کی تحریک کچلنے کی پالیسی چلاتا تھا۔ صفحات ۳۲ ، ۳۳

فورئیے (Fourier) ، شارل (۱۷۷۲ ء سے ۱۸۳۷ ء) — فرانس کا زبردست یوٹوپیائی (قیاسی) سوشلسٹ۔ صفحات ۴۲ ، ۴۵ ، ۴۹ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۷۹ ، ۸۲ ، ۸۳

فریڈرک ولیم سوم (Frederick William III) (۱۷۷۰ ء — ۱۸۴۰ ء) — پروشیا کا بادشاہ (۱۷۹۷ ء سے ۱۸۴۰ ء تک)۔ صفحہ ۸٦

— ک —

کارٹ‌رائٹ (Cartwright) ، ایڈمنڈ (۱۷۴۳ ء — ۱۸۲۳ ء) — انگریز میکانک ، پہلی کپڑا بننے کی مشین کا موجد۔ صفحہ ۲۸

کارلائل (Carlyle) ، ٹامس (۱۷۹۵ ء — ۱۸۸۱ ء) — انگریز مؤرخ اور عینیت‌پرست فلسفی ، قدامت‌پرست۔ انیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں اس نے کچھ کتابچے لکھے جن میں انگریز بورژوا طبقے پر تنقید کی۔ صفحہ ۴۴

کالوین (Calvin) ، ژان (۱۵۰۹ ء — ۱۵٦۴ ء) — تحریک اصلاح کا مشہور رہنما ، جس نے مسیحی مذہب میں پروٹسٹنٹ‌ازم کے ایک الگ فرقے ”کالوین‌ازم“ کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک سرمایہ

جمع ہونے کے ابتدائی مرحلے میں بورژوا مفاد کی ترجمان تھی۔
صفحات ۲۱، ۲۲

کانٹ (Kant)، ایمانوئیل (۱۸۰۴ء — ۱۷۲۴ء) — کلاسیکی جرمن
فلسفے کا بانی مبانی، عینیت پرست فلسفی۔ صفحات ۱۷، ۵۱، ۶۳

کاورڈ (Coward)، ولیم (۱۷۲۵ء — ۱۶۵۷ء) — انگریز مادیت پسند
فلسفی، ڈاکٹر۔ صفحہ ۱۲

کروموبل (Cromwell)، اولیور (۱۵۹۹ء سے ۱۶۵۸ء) — سترھویں
صدی کے انگلینڈ میں جب بورژوائی انقلاب اٹھا تو کروموبل نے
بورژوازی اور منصب داروں سے نئے نئے بورژوا بننے والے طبقے کی
رہنمائی کی۔ ۱۶۵۳ء سے آخر دم تک وہ انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ
اور آئرلینڈ کا لارڈ پروٹکٹر بنا رہا۔ صفحہ ۲۲

کوالیفسکی (Kovalevsky)، میکسم میکسموویچ (۱۹۱۶ء — ۱۸۵۱ء)
— روسی ماہر عمرانیات، مؤرخ اور قانون داں۔ ابتدائی قبائلی
تعلقات کے سلسلے میں اپنی تحقیقات کے لئے مشہور ہے۔ صفحہ ۸

کوبڈن (Cobden)، رچرڈ (۱۸۶۵ء — ۱۸۰۴ء) — انگریز بورژوا
صنعت کار، بورژوا سیاست داں، آزاد تجارت کا حامی، اناج کے قوانین
کی مخالف لیگ کا بانی۔ صفحہ ۳۳

کولنس (Collins)، انٹونی (۱۷۲۹ء — ۱۶۷۶ء) — انگریز
مادیت پسند فلسفی، لاک کا پیرو۔ صفحہ ۱۲

— گ —

گفن (Giffen)، رابرٹ (۱۹۱۰ء — ۱۸۳۷ء) — انگریز بورژوا ماہر
معاشیات اور ماہر علم اعدادوشمار۔ صفحہ ۹۳

— ل —

لافارگ (Lafargue)، پول (۱۹۱۱ء — ۱۸۴۲ء) — فرانسیسی اور
بین اقوامی مزدور تحریک کی ایک ممتاز شخصیت، فرانسیسی مزدور

پارٹی کے بانیوں میں سے ایک ، مارکس‌ازم کا ایک نمایاں پھیلانے والا ، مارکس اور اینگلس کا شاگرد اور رفیق‌کار ۔ صفحہ ۷

لاک (Locke) ، جان (۱۷۰۴ ع — ۱۶۳۲ ع) — ثنویت کا ماننے‌والا مشہور انگریز فلسفی جس نے فلسفے میں محسوسیت کو اہم قرار دیا ۔ صفحات ۱۲ ، ۵۹

لپلاس (Laplace) ، بیئر سیمون (۱۸۲۷ ع — ۱۷۴۹ ع) — فرانس کا ممتاز ماہر فلکیات ، ریاضی‌داں اور عالم طبیعیات ۔ اس نے کانٹ کی تحقیقات سے بے‌نیاز ہوکر یہ قیاس علم ریاضی کی بنیاد پر مہیا کی اور اسے ترقی دی کہ ہمارا نظام شمسی ابخرات جیسے دھند میں سے ابھرا ہے ۔ صفحات ۱۴ ، ۶۳

لوتھر (Luther) ، مارٹن (۱۴۸۳ ع سے ۱۵۴۶ ع) — مسیحیت کی اصلاحی تحریک کا مشہور رھنما جس نے جرمنی میں پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد رکھی ۔ جرمنی کے چودھری (برگر) ذہن کا نمائندہ ۔ صفحہ ۲۱

لوئی بوناپارٹ (Louis Bonaparte) — ملاحظہ ہو نپولین‌سوم ۔

لوئی فلپ (Louis Philippe) ، (۱۸۵۰ ع — ۱۷۷۳ ع) — فرانس کا بادشاہ (۱۸۴۸ ع — ۱۸۳۰ ع) ۔ صفحات ۲۳ ، ۳۱

لینئی (Linnaeus) ، کارل (۱۷۷۸ ع — ۱۷۰۷ ع) — سویڈن کا مشہور نیچرلسٹ ۔ پودوں اور جانوروں کی درجہ‌بندی کا ایک باقاعدہ نظام اسی نے تیار کیا ہے ۔ صفحہ ۶۵

— م —

مابلی (Mably) ، گیبرائل بونو (۱۷۸۵ ع — ۱۷۰۹ ع) — فرانسیسی ماہر سماجیت ، ' مساوات ، پسند یوٹوپیائی کمیونزم کا نظریہ‌ساز ۔ صفحہ ۴۲

مارکس (Marx) ، کارل (۱۸۸۳ ع — ۱۸۱۸ ع) ۔ صفحات ۸ — ۵ ، ۱۲ ، ۲۶ ، ۷۱ — ۶۸ ، ۸۰ ، ۸۱

مانٹیل (Mantell) ، گڈیون اولجیرنن (۱۸۵۲ ع — ۱۷۹۰ ع) — انگریز ماہر علم‌الارض ۔ صفحہ ۱۳

موڈی (Moody)، ڈوائٹ (۱۸۹۹ء — ۱۸۳۷ء) — امریکی مبلغ انجیل، واعظ ۔ صفحہ ۳۰

موریلی (Morelly) — فرانس میں اٹھارھویں صدی کے 'مساوات، پسند یوٹوپیائی کمیونزم کا نمائندہ ۔ صفحہ ۴۲

میٹرنک (Metternich)، کلیمنس وینزل (۱۸۵۹ء — ۱۷۷۳ء) — رجعت پرست آسٹریائی چانسلر، مقدس معاہدہ (Holy Alliance) کے منظم کرنے والوں میں سے ایک ۔ صفحہ ۸۶

مینرس (Manners)، جان جیمس رابرٹ (۱۹۰۶ء — ۱۸۱۸ء) — انگریز سیاست داں، قدامت پرست، کنزرویٹر وزارتوں میں کئی بار وزیر رہا ۔ صفحہ ۳۴

میونتسر (Münzer)، تھومس (تقریباً ۱۵۲۵ء — ۱۴۹۰ء) — جرمنی کا زبردست انقلابی، اصلاحی تحریکوں کے زمانے میں اور ۱۵۲۵ء کی کسانوں کی جنگ کے دنوں میں غریب کسانوں کا لیڈر اور ذہنی رہنما ۔ یوٹوپیائی 'مساواتی، کمیونزم کے خیالات کی تبلیغ کیا کرتا تھا ۔ صفحہ ۴۲

— ن —

نپولین اول (Napoleon I)، بوناپارٹ (۱۸۲۱ء — ۱۷۶۹ء) — فرانسیسی شہنشاہ (۱۸۱۴ء — ۱۸۰۴ء اور ۱۸۱۵ء میں) ۔ صفحات ۱۴، ۴۷، ۵۴، ۸۶

نپولین سوم (Napoleon III)، لوئی نپولین بوناپارٹ (۱۸۰۸ء سے ۱۸۷۳ء) — نپولین اول کا بھتیجا ۔ ۵۱ — ۱۸۴۸ء میں دوسری ریپبلک کا صدر تھا ۔ پھر ۱۸۵۲ء سے ۱۸۷۰ء تک فرانس کا شہنشاہ بنا رہا ۔ صفحہ ۳۰

نیوٹن (Newton)، اسحاق (آئزک) (۱۷۲۷ء — ۱۶۴۲ء) — شہرۂ آفاق عالم طبیعیات، انگریز ماہر فلکیات، ریاضی کے علوم پر حاوی، کلاسیکی میکانیکس کا موجد اور بانی ۔ صفحات ۶۳، ۶۵

واٹ (Watt) ، جیمس (۱۷۳۶ ء — ۱۸۱۹ ء) — انگریز ماهر طبیعیات ، انجنیر ، جدید بهاپ کے انجن کے موجدوں میں سے ایک۔ صفحه ۲۸

وائیٹلنگ (Weitling) ، ولهلم (۱۸۰۸ ء سے ۱۸۷۱ ء) — جرمنی میں جب مزدور تحریک نے سر اٹھایا تو یه شخص اس کا ایک اهم لیڈر تها۔ قیاس پر مبنی ’مساواتی‘ کمیونزم کے نظریه‌سازوں میں اس کا نام بهی آتا هے۔ پیشے سے درزی تها۔ صفحه ۵۶

وکٹوریه (Victoria) (۱۸۱۹ ء — ۱۹۰۱ ء) — ملکهٔ انگلستان (۱۸۳۷ ء — ۱۹۰۱ ء)۔ صفحه ۵۴

— ه —

هارٹلی (Hartley) ، ڈیوڈ (۱۷۰۵ ء — ۱۷۵۷ ء) — انگریز ڈاکٹر ، مادیت‌پسند فلسفی۔ صفحه ۱۲

هنری هفتم (Henry VII) (۱۴۵۷ ء — ۱۵۰۹ ء) — ۱۴۸۵ ء سے ۱۵۰۹ ء تک انگلینڈ کا بادشاه۔ صفحه ۲۳

هنری هشتم (Henry VIII) (۱۴۹۱ ء — ۱۵۴۷ ء) — ۱۵۰۹ ء سے ۱۵۴۷ ء تک انگلینڈ کا بادشاه۔ صفحه ۲۳

هوبس (Hobbes) ، تهومس (۱۵۸۸ ء — ۱۶۷۹ ء) — ممتاز انگریز فلسفی۔ میکانیکی مادیت‌پسندی کا نمائنده۔ صفحات ۱۰ — ۱۲ ، ۲۵

هیراقلیتس (Heraclitus) (چهٹی صدی قبل مسیح کا اختتام اور پانچویں صدی کا آغاز) — قدیم یونانی مادیت پسند فلسفی اور ماهرجدلیات۔ صفحه ۵۸

هیگل (Hegel) ، گیورگ ولهلم فریڈرک (۱۷۷۰ ء سے ۱۸۳۱ ء) — کلاسیکی جرمن فلسفے کی سب سے قداور شخصیت ، معروضی آئڈیلسٹ۔ صفحات ۱۶ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۵۱ ، ۵۷ ، ۶۲ — ۶۳

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکرگذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ : زوبوفسکی بلوار۔
نمبر ۲۱ ۔ ماسکو ، سوویت یونین

21, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR

Ф. ЭНГЕЛЬС

РАЗВИТИЕ СОЦИАЛИЗМА
ОТ УТОПИИ К НАУКЕ

На языке урду